اردو ناول میں عدمیت اور لایعنیت: انیس ناگی کے ناولوں کا تجزیاتی مطالعہ

(دیوار کے پیچھے، میں اور وہ، زوال)

مقالہ

برائے ایم۔ فل (اردو)

مقالہ نگار:

بدر النساء محمودہ

فیکلٹی آف لینگویجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

جون ۲۰۲۳ء

اردو ناول میں عدمیت اور لایعنیت: انیس ناگی کے ناولوں کا تجزیاتی مطالعہ

(دیوار کے پیچھے، میں اور وہ، زوال)

مقالہ نگار

بدر النساء محمودہ

یہ مقالہ

ایم فل (اُردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا۔

فیکلٹی آف لینگویجز

(اُردو زبان و ادب)

فیکلٹی آف لینگویجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

© بدر النساء محمودہ

مقالے کا دفاع اور منظوری کا فارم

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انھوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگویجز کو اس کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: اردو ناول میں عدمیت اور لایعنیت: انیس ناگی کے ناولوں کا تجزیاتی مطالعہ (دیوار کے پیچھے، میں اور وہ، زوال)

پیش کار: بدرالنساء محمودہ **رجسٹریشن نمبر:** 12MPhil/Urd/S20

ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: اُردو زبان و ادب

ڈاکٹر رخشندہ مراد

نگران مقالہ

____

پروفیسر ڈاکٹر جمیل اصغر جامی

ڈین فیکلٹی آف لینگویجز

____

تاریخ: ____________________

اقرارنامہ

میں بدرالنساء محمودہ حلفیہ بیان کرتی ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیاکام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو ئجز، اسلام آباد کے ایم۔فل اسکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر رخشندہ مراد کی نگرانی میں مکمل کیاہے۔میں نے یہ کام کسی اور ادارے یایونیورسٹی میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا اورنہ آئندہ کروں گی۔

بدرالنساء محمودہ

مقالہ نگار

فہرست ابواب

عنوان	صفحہ نمبر
مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم	iii
اقرار نامہ	iv
فہرست ابواب	v
Abstract	viii
اظہارِ تشکر	ix
باب اول: موضوع تحقیق کا تعارف اور بنیادی مباحث	۱
الف۔ تمہید	۱
i. موضوع کا تعارف	۱
ii. بیان مسئلہ	۲
iii. مقاصد تحقیق	۲
iv. تحقیقی سوالات	۲
v. نظری دائرہ کار	۳
vi. تحقیقی طریق کار	۴
vii. مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق	۴
viii. تحدید	۵
ix. پس منظری مطالعہ	۵
x. تحقیق کی اہمیت	۵
(ب)عدمیت: نظریہ: مفاہیم و تناظرات	۶
۱. معنی و مفہوم	۶
۲. ادبی تعریف اور مباحث	۶

۳. مغربی ادب اور اردو ادب میں عدمیت کے مطالعات کی روایت ۱۳
(ج): "لایعنیت" نظریہ: مفاہیم و تناظرات ۱۶
ا۔ معنی و مفہوم ۱۶
۲۔ ادبی تعریف و مباحث ۱۶
۳۔ مغربی ادب اور اردو ادب میں "لایعنیت" کے مطالعات کی روایت ۱۷
(د)۔ "عدمیت"، "لایعنیت" اور "وجودیت" کے فکری افتراقات ۲۰
حوالہ جات ۲۴
باب دوم: انیس ناگی کے ناولوں میں "عدمیت" کے اثرات کا جائزہ ۲۵
(دیوار کے پیچھے، میں اور وہ، زوال)
ا۔ سیاسی عدمیت (Political nihilism) ۲۹
ب۔ اخلاقی عدمیت (Moral nihilism) ۴۳
ج۔ وجودی عدمیت (Existential nihilism) ۵۳
حوالہ جات ۶۳
باب سوم: انیس ناگی کے ناولوں میں "لایعنیت" کے اثرات کا جائزہ ۶۷
(دیوار کے پیچھے، میں اور وہ، زوال)
ا۔ خودکشی ۷۶
۲۔ فلسفیانہ / فکری خودکشی ۸۰
۳۔ زندگی کی بے معنویت ۸۱
۴۔ تضاد ۸۴
۵۔ بے ربط پلاٹ ۸۶
۶۔ بے معنی مکالمے ۸۷
۷۔ سیاہ طنز ۸۸
حوالہ جات ۹۰

باب چہارم: ماحصل ۹۲
الف۔ مجموعی جائزہ ۹۲
ب۔ نتائج ۹۵
ج۔ سفارشات ۹۸
کتابیات ۹۹

Abstract

The search for meaning in life has always been a topic of discussion for humanity. Almost all schools of thought have discussed this topic since the birth of man. The nineteenth century is considered to be very important in terms of philosophical ideas. This century brought with it many questions related to all aspects of life, so terms like nihilism and absurdism were born regarding the meaning and meaninglessness of life.In this thesis, an analytical study of Anees Nagi’s selected novels, which include Dewar k Peechy, Main Aur Woh, and Zawal, has been done in the context of absurdism and nihilism. All these novels have an important place in Urdu literature. Novels have been selected that have prominent themes of nihilism and absurdism. Nihilism is a philosophical theory. It is based on one word: nothing. Nihilism in literature refers to an attitude based on religious, political, and social denial of existence. It has many types, like political nihilism, moral nihilism, existential nihilism, religious nihilism, and epistemological nihilism. Absurdism is a philosophical and literary movement that emerged in the mid-20th century. It is based on the idea that human beings exist in a meaningless and irrational universe and that attempts to find meaning or purpose in life are ultimately futile. Absurdism is often associated with existentialism, but it differs in that it emphasises the absurdity of the human condition rather than the search for meaning in it. Elements of absurdism include suicide, philosophical suicide, nonsense plots, black humour, and conflict. The first chapter of this thesis is the introduction and main discussion of the research topic. The second chapter is an analysis of the effects of "nihilism" on Nagi’s selected novels. The third chapter is an analysis of the effects of "absurdism" on the nagi’s selected novels. Fourth is the overall review, followed by results and recommendations. After the completion of this research paper, we have concluded that both nihilism and absurdism discuss the meaninglessness of life, and the effects of these two theories can be seen in the novels of Anees Nagi.

اظہارِ تشکر

اس پاک پروردگار کی شکر گزار ہوں کہ جس کے کرم کی بدولت یہ مقالہ پایہ تکمیل تک پہنچا۔ بلاشبہ یہ ایک کٹھن سفر تھا جو کہ میرے مہربان اساتذہ کی معاونت سے طے ہو سکا۔ جیسا کہ معروف مقولہ ہے: "جائے استاد خالی است"۔ اس حوالے سے میں شعبہ اردو کے تمام اساتذہ کی شکر گزار ہوں کہ جن کی بدولت تحقیق کے ہنر سے آشنائی ہوئی۔ مقالے کی تکمیل میں بالخصوص ڈاکٹر رخشندہ مراد کی تہ دل سے ممنون ہوں جن کی رہنمائی نے اس مشکل مرحلے کو آسان بنایا۔

میں اپنی یہ کامیابی اپنے والدین اور بہن بھائیوں کے نام کرتی ہوں جنہوں نے اس مرحلے میں میرا بھرپور ساتھ دیا۔ آج انہی کی مدد اور دعاؤں کے طفیل میں اس مقام تک پہنچی ہوں کہ ایم فل کے خواب کو حقیقت کا روپ دے سکی ہوں۔

بدرالنساء محمودہ

ایم۔ فل اسکالر (اردو)

باب اول:

تعارف اور بنیادی مباحث

ا۔ موضوع کا تعارف(Introduction)

زندگی میں معنویت کی تلاش ہمیشہ سے بنی نوع انسان کے لیے موضوعِ بحث بنی رہی ہے۔ انسان کی پیدائش سے لے کر اب تک تقریباً تمام مکتبہ فکر نے اس موضوع پر بحث کی ہے۔ انیسویں صدی فلسفیانہ نظریات کے حوالے سے بہت زیادہ اہم مانی جاتی ہے۔ یہ صدی اپنے ساتھ تمام شعبہ زندگی کے متعلق بہت سے سوالات لے کر آئی چنانچہ عدمیت اور لایعنیت جیسی اصطلاحات نے زندگی کی معنویت اور بے معنویت کے حوالے سے جنم لیا۔ اس دور میں لایعنیت کے مباحث کے ضمن میں اہم نام البیر کامیو ، نطشے، کافکا اور سورن کرکیگارڈ کے ہیں۔

تقسیمِ ہند کے بعد پاکستانی عوام انفرادی آزادی ، اپنے حیاتیاتی وجود اور نئ شناخت کے حوالے سے ذہنی کشمکش کا شکار تھی چنانچہ اس تمام صورتِ حال کو اردو ادب کے لکھنے والوں نے بہت شدت سے محسوس کیا اور نہ صرف محسوس کیا بلکہ اپنی تحریروں کا حصہ بھی بنایا۔ جن مصنفین نے ان موضوعات کو اپنی تحریروں کا حصہ بنایا ان میں انور سجاد، انتظار حسین، عزیز احمد، فہیم اعظمی اور انیس ناگی کے نام شامل ہیں۔ انہی لکھنے والوں میں سے انیس ناگی کا نام قابلِ ذکر ہے۔ انیس ناگی نے اپنی تحریروں میں اپنے دور کے حالات کو بہترین انداز میں پیش کیا ہے۔ انیس ناگی نے نہ صرف فرانسیسی ادب کا عمیق مطالعہ کیا بلکہ پابلو نرودا اور البرٹ کامیو جیسے بہترین فرانسیسی لکھاریوں کی تحریروں کا ترجمہ بھی کیا۔ انیس ناگی فرانسیسی ادب سے بہت متاثر تھے۔ انہوں نے کامیو کی کتاب " LEMYTHE DE SISPHE "کا اردو ترجمہ "سیفس کی کہانی" کے نام سے شائع کیا۔

انیس ناگی کا دور ایک ذہنی کشمکش کا دور تھا۔ جس میں زندگی کی معنویت کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔ ان کے ناولوں میں بے معنویت، انفرادی آزادی، روایات کی نفی، وجود کی تلاش اور انسان کی معاشرتی بے بسی کا اظہار دکھائی دیتا ہے۔ انیس ناگی کے ناول "دیوار کے پیچھے"، "میں اور وہ" اور "زوال" تینوں ناول اپنے عہد کے مذہبی، سیاسی، سماجی اور اقتصادی حالات کے بہترین عکاس ہیں۔ یہ تینوں ناول لایعنیت اور عدمیت جیسی تنقیدی اصطلاحات کو ساتھ لے کر چلے۔ میرے اس تحقیقی مقالے کا موضوع ان تینوں ناولوں کے

تنقیدی جائزے پر مبنی ہے۔ اس تحقیقی مقالے کا دائرہ کار منتخب ناولوں میں لایعنیت اور عدمیت کے عناصر کا مطالعہ کرنا ہے۔ جس کے تحت یہ دیکھا گیا ہے کہ انیس ناگی کے ناول دیوار کے پیچھے، میں اور وہ اور زوال میں ان فلسفیانہ تھیوریز کو کس انداز سے پیش کیا گیا ہے؟ اور منتخب کردہ ناولوں میں ان تھیوریز کے کون کون سے عناصر نمایاں ہیں؟

۲۔بیان کا مسئلہ(Statement of Problem)

مقصدِ حیات کی جستجو ہمیشہ سے انسان کے لیے اہم رہی ہے۔ جس کے نتیجے میں بہت سے نظریات اور تھیوریز سامنے آئیں۔ انہی نظریات میں سے عدمیت اور لایعنیت ہیں۔ جن کا اظہار ہمیں انیس ناگی کے ناولوں میں دکھائی دیتا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ:

- انیس ناگی کے منتخب کردہ ناولوں میں لایعنیت اور عدمیت کے عناصر کا مطالعہ کیا جائے۔
- ان کی تحریروں میں اس کی پیشکش کی نوعیت کو ڈھونڈا جائے۔
- ان کی پیشکش میں کارفرما داخلی اور خارجی عوامل کا جائزہ لیا جائے۔

چنانچہ مجوزہ تحقیق میں ان تینوں ناولوں کو لایعنیت اور عدمیت کے تناظر میں دیکھتے ہوئے ان کا تنقیدی جائزہ کیا گیا ہے۔

۳۔مقاصدِ تحقیق(Research Objectives)

ا۔اردو ناول میں لایعنیت اور عدمیت کے نظری مباحث کا تجزیہ و تفہیم کرنا

۲۔انیس ناگی کے مجوزہ ناولوں میں عدمیت کے اثرات کے محرکات اور پیشکش کی نوعیت کا مطالعہ کرنا

۳۔انیس ناگی کے مجوزہ ناولوں میں لایعنیت کے عناصر کی نوعیت کا جائزہ لینا

۴۔تحقیقی سوالات(Research Questions)

ا-اردو ناول پر عدمیت اور لایعنیت کے اثرات کی نوعیت کیا ہے؟

۲-انیس ناگی کے مجوزہ ناولوں میں عدمیت کے اثرات کے محرکات اور پیشکش کی نوعیت کیا ہے؟

۳-انیس ناگی کے مجوزہ ناولوں میں لایعنیت کے عناصر کی نوعیت کیا ہے؟

۵۔ نظری دائرہ کار(Theoretical Framework)

ادب کے ناقدین کے ہاں عدمیت (Nihilism)اور لایعنیت (Absurdism) کی اصطلاحات کو مختلف انداز اور تکنیکوں کے تحت استعمال کیا گیا ہے۔ یہ دونوں نظریات فلسفیانہ پس منظر کے حامل ہیں۔ اردو ادب میں لفظ "عدمیت " انگریزی اصطلاح Nihilism کا ترجمہ ہے ۔ نہلزم کا لفظ سب سے پہلے Ivan Turgenev نے اپنے ناول " Father and sons" میں استعمال کیا۔ مجوزہ تحقیقی مقالے میں عدمیت سے متعلق Nolen Gertz کی کتاب Nihilism اور Gideon baker کی کتاب Nihilism and philosophy کو مدِ نظر رکھا گیا ہے۔

ان ناقدین کے ہاں عدمیت کی بنیادی اقسام یہ ہیں:

Political nihilism(سیاسی عدمیت)

Existential nihilism(وجودی عدمیت)

Moral nihilism(اخلاقی عدمیت)

ان اقسام کے تحت انیس ناگی کے منتخب کردہ ناولوں کا تجزیاتی مطالعہ کیا جائے گا۔

لایعنیت کے ضمن میں مجوزہ تحقیق کے لیے مارٹن اسلین کی کتاب "Theatre of the Absurd"اور کامیو کی کتاب دی متھ آف سیسیفس کو مدِ نظر رکھا گیا ہے۔

ان ناقدین کے نزدیک لایعنیت کے عناصر یہ ہیں:

۱۔ خودکشی

۲۔ فلسفیانہ / فکری خودکشی

۳۔ زندگی کی بے معنویت

۴۔ تضاد

۵۔ بے ربط پلاٹ

۶۔ بے معنی مکالمے

۷۔ سیاہ طنز

ان عناصر کو سامنے رکھ کر ان تھیوریز کا ان تینوں ناولوں پر اطلاق کیا گیا ہے۔

۶۔ تحقیقی طریقہ کار(Research Methodology)

مجوزہ تحقیقی مقالے کا موضوع عدمیت اور لایعنیت کے تناظر میں انیس ناگی کے ناول "دیوار کے پیچھے"، "میں اور وہ" اور "زوال" کا تنقیدی جائزہ ہے۔ جس کے تحت سب سے پہلے عدمیت اور لایعنیت کے بنیادی مباحث کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ اس کے بعد "دیوار کے پیچھے"، "میں اور وہ" اور "زوال" میں عدمیت اور لایعنیت کی نوعیت کو ڈھونڈا گیا ہے۔ لہٰذا اس تحقیقی عمل کے دوران theory testing methodology کو مدِ نظر رکھا گیا ہے۔

اس تحقیقی عمل کے دوران انیس ناگی کے ذاتی خطوط، ان کی ناول نگاری کے متعلق ادبی جریدوں میں شائع ہونے والے تحقیقی و تنقیدی مضامین اور منتخب ناول نگار کے فن پر مختلف تبصرے اور تجزیوں تک رسائی حاصل کی گئی ہے ۔ مختلف کتب خانوں ، ڈیجیٹل لائبریری، مختلف یونیورسٹیوں کی لائبریریوں اور تحقیقی مقالوں کی ویب سائٹس سے استفادہ کیا گیا ہے تا کہ تحقیقی مقالے کے دوران مستند حوالے درج کیے جاسکیں۔

۷۔ مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق (Works Already Done)

انیس ناگی کے ناولوں پر یوں تو مختلف موضوعات کے تحت کام ہو چکا ہے جن کی فہرست درج ذیل ہے مگر عدمیت اور لایعنیت کے تناظر میں ان کے ناولوں پر اب تک سندی سطح پر کوئی کام نہیں ہوا۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ انیس ناگی کے ناولوں کا عدمیت اور لایعنیت کے تناظر میں جائزہ لیا جائے۔

۱۔ انیس ناگی کی افسانوی تحریریں۔ تحقیقی و تنقیدی جائزہ، افریحہ اسلم، تحقیقی مقالہ برائے ایم فل، ۲۰۱۱، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

۲۔ انیس ناگی کے ناول پتلیاں کا وجودیت کے تناظر میں تنقیدی جائزہ، عقیل حیدر، تحقیقی مقالہ برائے ایم فل، نیشنل نیورسٹی آف ماڈرن لینگو ئجز، اسلام آباد

۳۔ انیس ناگی کے افسانوی ادب میں جدیدیت کی عکاسی: تحقیق و تنقید، تحقیقی مقالہ برائے پی۔ ایچ۔ ڈی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد۔

۸۔ تحدید(Delimitation)

انیس ناگی اردو ادب کے ایک نامور تخلیق نگار ہیں۔ انہوں نے ناول، شاعری، ترجمہ نگاری اور تنقید کے میدان میں قابلِ قدر خدمات سر انجام دی ہیں۔ انیس ناگی نے یوں تو بہت سے ناول لکھے ہیں لیکن مجوزہ تحقیق کے لیے ان کے پہلے تین ناول منتخب کیے گئے ہیں۔ مجوزہ موضوعِ تحقیق انیس ناگی کے ناول "دیوار کے پیچھے"، "میں اور وہ" اور زوال کا عدمیت اور لایعنیت کے تناظر میں مطالعہ ہے۔

۹۔ پس منظری مطالعہ:(LITERATURE REVIEW)

مجوزہ موضوع پر کام کرنے کے لیے جن کتب کا مطالعہ کیا گیا ہے ان میں انیس ناگی کے ناول دیوار کے پیچھے، میں اور وہ اور زوال شامل ہیں۔ اس کے علاوہ اردو ناول سے متعلق تحقیقی اور تنقیدی کتب جن میں پروفیسر ناز قادری کی تصنیف "اردو ناول کا سفر (تحقیقی و تنقیدی جائزہ)" اور ڈاکٹر ممتاز احمد خان کی کتاب "آزادی کے بعد اردو ناول ہئیت، اسالیب اور رجحانات" کا مطالعہ کیا گیا ہے۔

موضوع کے پیشِ نظر انیس ناگی کی شخصیت اور فن کے حوالے سے ڈاکٹر شاہین مفتی کی کتاب "انیس ناگی: شخصیت اور فن" کا مطالعہ کیا گیا ہے۔

مجوزہ موضوع کے تحت لایعنیت کے حوالے سے انگریزی زبان میں دو کتب کا مطالعہ کیا گیا ہے جن میں Neil cornwell کی کتاب "The Absurd in Literature" اور Michael Bennett کی "introduction to theatre and literature of AbsurdThe Cambridg" کا مطالعہ کیا گیا ہے۔

عدمیت کے حوالے سے بھی دو کتابوں پر گہری نظر ڈالی گئی ہے جن میں Nolen Gertz کی کتاب "Nihilism" اور Gideon Baker کی کتاب "Nihilism and Philosphy" شامل ہیں۔

۱۰۔ تحقیق کی اہمیت(Significance of Research)

عدمیت اور لایعنیت کو مجوزہ تحقیق کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ انیس ناگی کا شمار اردو ادب کے کامیاب ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔ انیس ناگی پر مختلف انداز سے کام ہو چکا ہے مگر عدمیت اور لایعنیت کے حوالے سے ان پر اب تک کوئی کام نہیں ہوا۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ عدمیت اور لایعنیت کے تناظر میں انیس ناگی کے ناول "دیوار کے پیچھے" "میں اور وہ" اور "زوال" کا جائزہ لیا جائے۔ جس سے اردو ادب میں نئے

موضوعات کو جگہ ملے گی اور نئے مباحث کے لیے راہ ہموار ہو گی ۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اردو ناول پر عدمیت اور لایعنیت جیسے اہم نظریات کا اطلاق کیا گیا ہے جس سے اردو ناول کا ایک نیازاویہ سامنے آیا ہے۔ میری اس تحقیق سے انیس ناگی کے فکری رجحانات ایک مختلف انداز سے منظر عام پر آئے ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ بیسویں صدی کے حالات نے پاکستانی معاشرے کو کس طرح متاثر کیا اور اس عہد میں انسان کس ذہنی اور فکری اضطراب سے گزرا۔ اس تحقیق سے اردو تنقید مشرقی اور مغربی لایعنیت اور عدمیت سے آشنا ہو گی۔

ب۔عدمیت: نظریہ:مفاہیم وتناظرات

ا۔ معنی ومفہوم:

اردو ادب میں لفظ "عدمیت" انگریزی اصطلاح Nihilism کے متبادل کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ نہلزم کا لفظ "لاطینی" لفظ "نہل" سے نکلا ہے۔ جس کے معنی "Nothing at all" کے ہیں۔

انٹرنیٹ انسائیکلوپیڈیا آف فلوسفی میں اس کے معنی یوں درج ہیں:

“Nihilism comes from the Latin *nihil*, or nothing, which means not anything, that which does not exist".[۱]

۲۔ادبی تعریف اور مباحث:

عدمیت ایک فلسفانہ نظریہ ہے۔ جس کی بنیاد ایک لفظ nothing پر ہے۔ادب میں عدمیت سے مراد وہ رویہ ہے جو مذہبی، سیاسی، سماجی اور وجود کے انکار پر مبنی ہے–اس کے متعلق ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

"عدمیت؛ فنائیت؛ انکارِ کل لاشعئیت یالاوجودیت۔ فلسفہ تشکک کی انتہائی قسم
جس میں ہر قسم کے وجودِ حقیقی سے انکار کیا جاتا ہے؛ مذہب یا اخلاقی اصولوں
اور ذمہ داریوں اور مسلمہ قوانین اور اداروں سے مکمل بے اعتقادی"۔[۲]

Nolen Gertz نے اپنی کتاب nihilism میں عدمیت کی تعریف یوں کی ہے:

“Nihil means “nothing”. _ism means “ideology”. Yet when we

try to combine these terms, the combination seems to Immediately refute itself as the idea that nihilism is the "Ideology of nothing". Nihilism as an "idea of nothing" Would mean not that we adhere to a discernible system of beliefs about nothingness, but rather that the beliefs We have, or think we have , are equivalent to nothing".(۳)

پسِ منظر:

زندگی میں معنویت کی تلاش ہمیشہ سے بنی نوع انسان کے لیے موضوعِ بحث بنی رہی ہے۔ انسان کی پیدائش سے لے کر اب تک تقریباً تمام مکتبہ فکر نے اس موضوع پر بحث کی ہے۔ سقراط سے لے ب تک جتنے بھی فلسفی گزرے ہیں ان سب کے نظریات کا بنیادی مرکز زندگی میں معنویت کی تلاش ہے۔ مذہبی نقطۂ نظر میں زندگی ایک معروضی معنی رکھتی ہے۔ یہودیوں کی عیسائی روایات میں اس دنیا کی تاریخ ایک طرف خداؤں کی تخلیق اور دوسری طرف قیامت کے دن جنت اور جہنم کے فیصلے پر محیط ہے۔ بدھ مت اور ہندو مت میں کرما کی کہانی بیان کی جاتی ہے اور نہ ختم ہونے والا پیدائش کا سلسلہ۔ جس کا اختتام جنت یا جہنم پر نہیں بلکہ آزادی پر ہوتا ہے جیسے موشکا ہندومت اور نروان بدھ مت میں کہا جاتا ہے۔ انہی مغربی اور مشرقی عقائد کے نظام میں انسانیت کو ایک بلند مقام حاصل تھا لیکن جیسے جیسے جدیدیت کا عالمی نظریہ پروان چڑھتا گیا تو ان مذہبی تصورات کے اثرات غیر متاثر ہوتے گئے اور زندگی کا مطلب بھی ختم ہوتا گیا۔ اس دور میں حقیقت پسندی کو زیادہ اہمیت دی جانے لگی اور جس کی بدولت اب دنیا کے وجود کی وضاحت کے لیے الوہیتوں پر انحصار سے انکار کیا جانے لگا۔ ان الوہیتوں اور ان سے جڑے ہوئے عقائد ختم ہونا شروع ہو گئے۔ جیسا نطشے نے کہا کہ عیسائیت نے سچائی کو قدر کی نگاہ سے دیکھا اور اس خوبی سے اپنے پیروکاروں کو پیدا کرنے کی کوشش کی۔ انیسویں صدی میں سیکولر نظریات بہت زیادہ سامنے آئے۔ ۱۸۳۰ کی دھائی میں ڈیویڈ سٹر اس نے اپنی کتاب Life of jejus لکھی۔ یہ کتاب ایک نیا بحران لے کر آئی جس نے ایک تاریخی کتاب کے طور پر بائیبل کے یقین کو ختم کر دیا۔ ۱۸۴۱ میں لڈوگ فیورباخ کی کتاب عیسائیت کے جوہر منظر عام پر آئی۔ جس میں یہ کہا گیا کہ خدا انسانیت کی نفسیاتی تخلیق ہے۔ فیورباچ کی کتاب نے کارل مارکس کو بہت متاثر کیا۔ اسٹر اس اور فیورباخ کے بعد مذہبی بیانیہ کے قلب میں اصل گھاؤ ۱۸۵۹ میں ڈارون کے پرجاتیوں کی اصل کی اشاعت نے لگایا۔ اس ثقافتی رجحان کا اختتام آخر کار اس تباہ کن واقعہ پر ہوا جس میں نطشے کا دیوانہ میڈ مین ہم جنس پرستوں کی

سائنس میں بات کرتا ہے۔ نطشے کا میڈ مین روشن صبح میں لالٹین جلا کر بازار میں خدا کی تلاش کے لیے نکلتا ہے تاکہ شہر کے لوگ جدیدیت کے تمام حامی اس کا مذاق اڑائیں اور پھر میڈ مین ایک تقریر کرتا ہے کہ خدا کہاں ہے ؟ وہ چلاتا ہے۔ میں تمہیں بتاتا ہوں ہم نے اسے مار دیا ہے میں نے اور تم نے۔ ہم سب اس کے قاتل ہیں۔ لیکن ہم نے یہ کیسے کر دیا؟ ہم کیسے اس قابل ہو گئے کہ ہم نے سمندر پی لیا۔ کس نے ہمیں سپنج دیا کہ ہم پورے افق کو مٹا دیں۔ ہم کیا کریں گے جب ہم دنیا کو سورج سے دور کر دیں گے۔ یہ دنیا ابھی کہاں گھوم رہی ہے ؟ ہم کہاں گھوم رہے ہیں تمام سیاروں سے دور ؟ کیا ہم مسلسل ڈوب نہیں رہے ؟ آگے کی طرف، پیچھے کی طرف، تمام سمتوں میں،، کیا کوئی اوپر نیچے رہ گیا ہے ؟ کیا ہم ایک لا محدود چیز کی طرح گمراہ نہیں ہو رہے ؟ کیا ہمیں ابھی کچھ سنائی نہیں دیتا؟ قبر کھودنے والوں کا شور جو خدا کو دفن کر رہے ہیں۔ خدا کے وجود کا گلنا؟ کیا ہم ابھی تک کچھ نہیں سونگھ سکتے ؟ خدا کا وجود بہت زیادہ گل چکا ہے۔ خدا مر چکا ہے اور وہ مردہ رہے گا۔ ہم نے اسے مار ڈالا ہے۔ ہم سب قاتلوں کے قاتل خود کو کیسے پر سکون رکھیں گے ؟ جو دنیا میں سب سے مقدس ہے اور سب سے زیادہ طاقت ور تھا وہ ہماری چھریوں کے نیچے موت کے گھاٹ اتر چکا ہے۔ یہ خون ہماری چھریوں سے کون مٹائے گا؟ نطشے کا یہ بیان عدمیت کا صاف اور کھلے لفظوں میں اظہار تھا۔ یہ معروضی اقدار کمزور کرنے کا اعلان تھا۔ خدا کی موت نے ہمارے تمام رشتوں کو حقیقت کی طرف پھینک دیا۔ اسے مزید فلسفانہ طور پر دیکھا جائے تو زندگی کی بے معنویت کے احساس کی بنیاد خدا تھا۔ خدا کے بغیر دنیا میں معنویت کا فقدان پیدا ہو گیا۔ زندگی بے معنی اور بے مقصد ہو گئی اور یہ فعل تباہ کن تھا۔ اخلاقیات اور انسانی مقصد کی بنیاد گر گئی اور یہی سب سے بڑی تباہی تھی۔ یہی وہ بحران تھا جس نے عدمیت کو جنم دیا۔ بائبل کی تنقید کے مضمرات، کوپر نیکس، نیوٹن اور بعد میں ڈارون کے نظریات کے بعد حقیقت اب جغرافیائی اور بشری مرکز نہیں رہی اور اس قانونی کائنات کے ساتھ جس کا نیوٹن پردہ فاش کرنا شروع کیا اور جس کے ارتقا کی کہانی ڈارون نے بیان کی اس کی اب کوئی اہمیت نہ رہی۔ ڈارون نے اس حقیقت سے پردہ اٹھایا کہ اب خدا کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بیرونی دنیا کے لیے مادی وضاحتیں مذہبی وضاحتوں سے کہیں زیادہ موثر ثابت ہوئیں اور اس لیے ان مذہبی کہانیوں کو ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا گیا۔ مصیبت یہ تھی کہ یہ مذہبی وضاحتیں انسانی

اخلاقیات اور معنویت کی بنیادوں سے منسلک تھیں۔ خدا کی موت نے ایک معنی خیز بحران کا اعلان کیا۔ یہی وہ بنیادی مسئلہ تھا جس سے بعد میں لایعنیت اور وجودیت نے جنم لیا۔

اسی لیے اٹھارہویں صدی سائنسی ایجادات کے حوالے سے اہم مانی جاتی ہے۔ روشن خیالی کی سائنسی دریافتوں نے ماضی کی روایات کو توڑ دیا۔ اس دور میں زندگی کے ہر پہلو کو سائنس کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔ جس کی بدولت مذہبی عقائد جو کبھی بڑے پیمانے پر قبول کیے گئے تھے ان پر سوالوں اٹھائے جانے لگے، اور بہت سے لوگوں نے ان نظریات کو شک کی نگاہ سے دیکھنا شروع کر دیا۔ اسی پسِ منظر میں بہت سے سوالات سر اٹھانے لگے جنھوں نے مذہبی نظریات کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا یہاں تک خدا کے وجود کے متعلق بھی مفکرین نے غور و فکر شروع کیا۔ مفکرین نے یہ سوالات اٹھائے کہ کیا کوئی خدا ہے یا نہیں؟ اور اگر خدا کا وجود ہی نہیں تو خدا کے بغیر، اخلاقیات، شادی، موت اور روحانیت جیسے نظریات بھی بے معنی ہیں۔ یہی وہ سوالات تھے جس کی وجہ سے عدمیت نے جنم لیا۔ اور انیسویں صدی کے آغاز میں عدمیت کو باقاعدہ ایک مکتبۂ فکر کے طور پر متعارف کروایا گیا۔ وہ فلسفی جنہوں نے عدمیت کے بارے میں لکھا وہ عام طور پر معاشرے میں اس بڑھتی ہوئی بے حسی، بے چینی اور بے معنویت کے مضر اثرات کے بارے میں فکر مند تھے۔

آغاز اور ارتقاء:

عدمیت اصل میں اخلاقی، مذہبی اور علمی شکوک و شبہات کا ایک فلسفہ ہے۔ یوں تو اس کا آغاز N.I Nadezhdin نے اپنے مضمون سے کیا اور باقاعدہ ایک فلسفانہ تھیوری کے طور پر IvanTurgenev نے اپنے ناول father and sons میں اسے متعارف کروایا۔ لیکن اگر فلسفے کی تاریخ پر نظر دوڑائی جائے تو کم و بیش تمام مفکرین کے یہاں ہمیں عدمیت کے بنیادی تصورات دکھائی دیتے ہیں۔ قدیم جرمنی مفکرین کی تخلیقات میں عدمیت کے نظریات موجود ہیں۔ سقراط جسے فلسفے کا باپ کہا جاتا ہے ان کی تعلیمات میں بھی عدمیت کے تصورات دکھائی دیتے ہیں۔ سقراط نے اپنی کتاب republic میں زندگی کی بے معنویت کو بھی اپنا موضوع بنایا جب Athenian نے زندگی کے بنیادی پہلو مثلاً محبت، علم، اور انصاف وغیرہ پر اپنے نظریات بیان کیے۔ سقراط نے اپنی کتاب republic 7 میں Athenian کے نظریات پر سوالات

اٹھائے۔ اس حوالے سے Nolen Gertz اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ سقراط نے اپنے ساتھی ایتھنز سے کہا کہ وہ قیدیوں کا تصور کریں۔ جو پیدائش سے لے کر اب تک زیر زمین غار میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ان کے پاس ایک دوسرے کے سائے کے علاوہ کچھ نہیں ہے جسے وہ دیکھ سکیں یا اس کے بارے میں کچھ سوچ سکیں۔ ان کے پاس تجربے کے لیے کچھ نہیں ہے، سیکھنے کے لیے کچھ نہیں، سائے کے علاوہ بات کرنے کے لیے کچھ نہیں۔ سقراط ایسے قیدیوں کی ہولناک زندگی بیان کرنے کے بعد یہ بتاتا ہے کہ ان کی زندگیاں گزر گئیں اور وہ کچھ نہ جان سکے سوائے ایک دوسرے کے سائے کے انہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ اس زندگی کے علاوہ بھی کوئی زندگی ہے جو انہوں نے غار میں گزاری انہوں نے غار سے باہر کی دنیا کے بارے میں بغیر جانے ہی اپنی زندگی گزار دی اور انہیں یہ علم ہی نہیں تھا کہ وہ قیدی ہیں جنہیں غار میں قید یا گیا ہے، سقراط نے ان قیدوں کو ہم سے مماثل قرار دیتے ہوئے کہا کہ "وہ ہمارے جیسے ہیں"۔ سقرط نے اینتھینز ے میں اسی طرح مختلف جگوں پر عدمیت کے نظریات پیش کیے ہیں۔ سقراط کے بعد مشہور ماہرِ ریاضی Rene Descartes ایک فرانسیسی مفکر تھے۔ انہوں نے ارسطو کے روایتی نظریات کے سائے تلے تعلیم حاصل کی۔ مگر وہ ان نظریات سے مطمئن نہیں تھے۔ انہوں نے سقراط کی طرح یہ کہا کہ جسے علم کہا جاتا ہے ضروری نہیں کہ وہ درست ہو۔ سقراط کی نظر میں علم کی بنیاد کو بحث کے ذریعے ڈھونڈا جاسکتا ہے جبکہ Descartes کی نظر میں meditation کی مدد سے۔ Descartes نے دریافت کیا کہ سب سے زیادہ ناقابلِ اعتبار علم کی بنیاد تجربہ، ایمان اور احساس نہیں بلکہ ہماری اپنی ذات میں موجود بے معنویت کا احساس ہے۔ جس کا تدارک meditation سے کیا جاسکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ میں اس قیدی کی طرح ہوں جو خیالی آزادی سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔ سوتے وقت؛ جب اسے شک ہونے لگتا ہے کہ وہ سو رہا ہے، وہ بیدار ہونے سے ڈرتا ہے، اور گہری نیند میں سویا رہتا ہے۔ وہ اس خوش فہمی میں رہنا چاہتا جب تک وہ رہ سکتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اسی طرح میں خوشی سے اپنی پرانی رائے اور خوف میں واپس آگیا۔ مجھے ہلایا جارہا ہے، اس خوف سے کہ میری پر امن نیند کے بعد سخت مشقت ہوسکتی ہے جب میں بیدار ہوں گا، اور یہ کہ مجھے روشنی

میں نہیں بلکہ اندھیرے میں محنت کرنی پڑے گی۔ان مسائل کی تاریکی جو مسائل میں نے اب کھڑے کیے ہیں۔

سقراط کی نظر میں عدمیت کے مسئلے کو روشن خیالی کی مدد سے کم کیا جا سکتا ہے جبکہ hume کی نظر میں اسے کم نہیں کیا جا سکتا۔اس کے علاوہ backgammon اور kant نے اس بحث کو مزید تقویت بخشی۔ انہوں نے کہا کہ عدمیت وہ فلسفانہ نظریہ ہے جو علم، مذہب اور اخلاقیات وغیرہ جیسے شعبہ زندگی کے بنیادی تصورات کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے ان سے انکار کرتا ہے۔

عدمیت کا باقاعدہ آغاز Tsar Alexander کے دورِ حکومت کے ابتدائی سالوں کے دوران انیسویں صدی میں روس میں ہوا۔جب ۱۸۲۹ میں NadezhdinN.I نے اپنے مضمون "Messenger of Europe" میں اس فلسفانہ تھیوری کے متعلق بحث کرتے ہوئے روسی شاعر "leksandrpushkin" کی شاعری پر اس کا اطلاق کیا۔ اسی طرح 1858 میں "V.V BARVI" نے عدمیت اور scepticism کو مساوی قرار دیا۔ اس کے بعد "Mikhail nikiforovichkatkov" جو کہ ایک قدامت پسند صحافی تھے انہوں نے عدمیت کی تشریح "Revolution" یعنی "انقلاب" کے نام سے کی۔ عدمیت کو شہرت "IvanTurgenev" کے ناول "Father and sons" سے حاصل ہوئی۔ جس کی اشاعت ۱۸۶۲ میں ہوئی۔ باپ اور بیٹے میں bazarov کے کردار کے ذریعے عدمیت کے نظریات کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔مثلاً وہ کہتا کہ وہ ایک نہلسٹ ہے!

"ایک کیا؟" نکولائی پیٹر ووچ نے پوچھا، جب کہ اس کے بھائی نے نوک پر مکھن کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا رکھ کر چاقو ہوا میں اٹھایا اور بے حرکت رہا۔

آرکاڈی نے دہرایا۔

نکولائی پیٹر ووچ نے کہا، "ایک عدمیت پسند۔" یہ لاطینی لفظ نہل سے نکلا ہے۔جس کے معنی nothing. معنی کچھ بھی نہیں کے ہیں، میں تصور کرتا ہوں؛ اصطلاح کا مطلب ایک آدمی ہونا چاہیے جو جو کچھ نہیں پہچانتا؟"

"کہو- جو کسی چیز کا احترام نہیں کرتا ہے،" پاول پیٹروچ نے بتایا، اور مکھن کے ساتھ دوبارہ کام کرنے لگا۔

"جو ہر چیز کو تنقیدی نظر سے دیکھتا ہے،" آرکاڈی نے کہا۔

"کیا یہ بالکل وہی چیز نہیں ہے؟" پاول پیٹرووچ نے پوچھا۔

"نہیں، یہ ایک ہی چیز نہیں ہے. نہلسٹ وہ شخص ہوتا ہے جو کسی اصول کو قدر کی نگاہ سے نہیں لیتا، چاہے اس اصول کا جتنا بھی احترام کیا جائے۔

انیسویں صدی کی چھٹی اور ساتویں دہائی کے نہیلسٹ کو سماجی اور معاشی روایات کا مخالف قرار دیا جاتا ہے۔ لبرل ازم کے دور میں "N.G Chernyshevsky" نے فرد کی آزادی اور نوجوانوں کے باغی رویے کی اپنے ناول 1863) "What is to be done ?" (میں عکاسی کی۔ انہوں نے عدمیت کے مثبت پہلوؤں کی نشاندہی کی۔ اس نے روسی شہزادے کی یاد میں جو کتاب لکھی اس میں اس نے عدمیت کی تعریف یوں کی ہے کہ عدمیت ہر قسم کے ظلم کے خلاف جدوجہد کی علامت ہے، منافقت، مصنوعی پن اور انفرادی آزادی کے لیے۔

انیسویں صدی میں عدمیت نے تمام کلاسیکی فلسفانہ نظریات کی مجموعی طور پر نفی کی۔ انہوں نے چرچ اور موروثی بادشاہت کے ماتحت نظام کی سخت مخالفت کی۔ انہوں نے اپنے نظریات کی بنیاد ایک لفظ "nothing" پر رکھتے ہوئے کہا کہ تمام تصورات بے بنیاد ہیں سوائے سائنس کے۔ تمام نہیلسٹ کا نعرہ علم کی کمی ہے اور اس کا واحد حل صرف سائنس ہے۔ ۱۸۸۳ سے ۱۸۸۵ کے درمیان نطشے نے عدمیت کے متعلق اپنا پہلا ناول "Thus spoke Zarathustra" لکھا۔ جس میں انہوں نے "Death of god" کا نعرہ لگایا۔ نطشے لکھتا ہے کہ خدا مر چکا ہے اور وہ مردہ رہے گا۔ ہم نے اسے مار ڈالا ہے۔ ہم سب قاتلوں کے قاتل خود کو کیسے پر سکون رکھیں گے؟ جو دنیا میں سب سے مقدس ہے اور سب سے زیادہ طاقت ور تھا وہ ہماری چھریوں کے نیچے موت کے گھاٹ اتر چکا ہے۔ یہ خون ہماری چھریوں سے کون مٹائے گا؟ نطشے کا یہ بیان عدمیت کا صاف اور کھلے لفظوں میں اظہار تھا۔ یہ معروضی اقدار کمزور کرنے کا اعلان تھا۔ خدا کی موت نے ہمارے تمام رشتوں کو حقیقت کی طرف پھینک دیا۔ نطشے کو عدمیت کے حوالے سے بہت اہم

مقام حاصل ہے۔اس کے علاوہ the will to power میں بھی عدمیت کے حوالے سے تفصیلی بحث موجود ہے۔

عدمیت کی اقسام کو Nolen Gertz نے یوں بیان کیا ہے:

نولن گیرٹز کے نزدیک عدمیت کی ہر قسم انسانی زندگی کے کسی نہ کسی پہلو سے انکار کرتی ہے۔سیاسی عدمیت سیاسی نظام کی نفی کرتی ہے۔وہ سیاسی ڈھانچے جن کے اندر فی الحال زندگی بسر کی جاتی ہے اور وہ تمام سماجی او معاشی نظریے جو اس نظام کو تشکیل دینے میں مدد کرتے ہیں یہ ان سب کو مسترد کرتی ہے۔ اخلاقی عدمیت اخلاقی اقدار کو مسترد کرتی ہے اس کے نزدیک زندگی میں کوئی اخلاقی نظریات نہیں ہیں جو زندگی گزارنے کے لیے اہم ہوں۔نولن نے تیسری قسم علمی عدمیت کی بتائی ہے۔جس کے تحت کوئی بھی علم قابلِ قبول نہیں ہے۔علم جیسی کوئی چیز اس دنیا میں موجود نہیں اور چوتھی قسم وجودی عدمیت کی بتائی ہے جس کے تحت انسانی وجود بے معنی ہے۔عدمیت کی بنیادی اقسام یہ ہیں:

۱. Epistemological nihilism
۲. Metaphysical nihilism
۳. Political nihilism
۴. Existential nihilism
۵. Moral nihilism
۶. Buddhist nihilism

۱-علمی عدمیت: (Epistemological nihilism)

فلسفیانہ شکوک وشبہات کی ایک شکل ہے جس کے مطابق علم کا کوئی وجود نہیں ہے، یا اگر یہ موجود ہے تو یہ انسانوں کے لیے ناقابلِ حصول ہے۔اسے epistemological fallibilism کے ساتھ الجھایا نہیں جانا چاہیے، جس کے مطابق تمام علم غیر یقینی ہے۔

اس حوالے سے Descartes نے کافی تفصیلی بحث کی ہے۔Carr نے اس کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

"*Epistemological nihilism*, 'the denial of the possibility of knowledge'.... Epistemological nihilists believe that there can be no standards by which truths can be differentiated from untruths. A type of 'anything goes' in the metaphysical realm"..(۴)

۲-مابعد الطبیعاتی عدمیت(Metaphysical nihilism) :

مابعد الطبیعاتی عدمیت ایک فلسفیانہ نظریہ ہے کہ شاید کوئی بھی چیز نہ ہو—یعنی کہ ایک ممکنہ دنیا ہے جس میں کوئی بھی چیز نہیں ہے۔ یا یہ کہ شاید کوئی ٹھوس اشیاء ہی نہ ہوں، اس لیے اگر ہر ممکن دنیا میں کچھ اشیاء موجود ہوں تو کم از کم ایک ایسی ضرور ہے جو صرف تجریدی اشیاء پر مشتمل ہے۔ Carr نے اس کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

" Existential *nihilism* 'is the feeling of emptiness and pointlessness that follows from the judgement, "Life has no meaning"..(۵)

۳-سیاسی عدمیت: (Political nihilism)

سیاسی عدمیت کے مطابق اانسان کی زندگی میں کوئی بھی سیاسی اہداف نہیں ہوتے ہیں، سوائے تمام موجودہ سیاسی اداروں کی مکمل تباہی کے- ان اصولوں، اقدار اور سماجی اداروں کے ساتھ جو انہیں برقرار رکھتے ہیں۔ Nolen Gertz نے اس کی تعریف یوں کی ہے:

"Political nihilism negates the political structures within which life is currently lived, as well as the social and cultural outlooks that inform these structures. It has little or no vision of constructive alterntives or of how to achieve them"..(۶)

۴-وجودی عدمیت.:(Existential nihilism)

وجودی عدمیت ایک فلسفیانہ نظریہ ہے جس کے مطابق زندگی کا کوئی باطنی معنی یا قدر نہیں ہے۔ کائنات کے حوالے سے، وجودی عدمیت یہ بتاتی ہے کہ ایک انسان یا حتیٰ کہ تمام انسان غیر اہم ہیں، بے مقصد ہیں اور وجود کی مجموعی تبدیلی کا امکان نہیں ہے۔ اس نظریے کے مطابق، ہر فرد کائنات میں پیدا ہونے والا ایک الگ تھلگ وجود ہے، جسے 'کیوں' جاننے سے روک دیا گیا ہے۔ زندگی کی موروثی بے معنویت کو بڑی حد تک فلسفیانہ مکتبِ وجودیت میں تلاش کیا جاتا ہے، جہاں کوئی شخص ممکنہ طور پر اپنا موضوعی 'معنی' یا 'مقصد' بنا سکتا ہے۔ عدمیت کی تمام اقسام میں سب سے زیادہ وجودی عدمیت کو اہمیت دی جاتی ہے۔

Carr نے اس کی تعریف یوں کی ہے:

> "*Existential nihilism* 'is the feeling of emptiness and pointlessness that follows from the judgement, "Life has no meaning". This is a 'passive' form of nihilism, one that Glicksberg likens to Buddhism, in that 'life is an empty dream, action is futile, and striving for happiness, fulfilment, or perfection betrays the fact that one is still the slave of illusion.".(۷)

۵ -اخلاقی عدمیت(Moral nihilism):

اخلاقی عدمیت ایک ایسا نظریہ ہے جس کی نظر میں اخلاقی دعوے عام طور پر غلط ہوتے ہیں۔ اس کا خیال ہے کہ کوئی معروضی اخلاقی حقائق یا سچی تجاویز نہیں ہوتی ہیں - اخلاقی طور پر کچھ بھی اچھا، برا، غلط، صحیح وغیرہ نہیں ہے - کیوں کہ اخلاقی سچائیاں نہیں ہیں۔ (مثال کے طور پر ایک اخلاقی نہلسٹ کہے گا کہ قتل غلط نہیں ہے، لیکن نہ ہی یہ درست ہے)۔

Carr نے اس کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

> "*Ethical/Moral nihilism*, the denial of objective morality. The ethical nihilist does not claim the morality is absent, rather, she

does claim that the perpetrator adopts moral or ethical claims to suit their own bias”..[۸]

۶-بدھوعدمیت(Buddhist nihilism):

نطشے نے ابتدائی بدھ مت کے نظریات کو "غیر فعال عدمیت" کی ایک شکل کے طور پر سمجھا۔ انہوں نے "روح کی طاقت کے زوال" کا اشارہ دیا۔ وہ اس کا مقابلہ فعال عدمیت سے کرنا چاہتے ہیں - ایک روح کی بڑھتی ہوئی طاقت سے جو ان تمام عقائد کی شعوری تباہی پر زور دیتا ہے جو پہلے معنی رکھتے تھے۔

ج۔ "لایعنیت" نظریہ: مفاہیم و تناظرات

ا۔ معنی و مفہوم:

اردو ادب میں لفظ "لایعنیت" انگریزی اصطلاح Absurdism کے متبادل کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ Absurdism کا لفظ "لاطینی" لفظ "ابسرڈ" سے نکلا ہے۔ جس کے معنی "مضحکہ خیز، غیر معمولی اور غیر حقیقی" کے ہیں۔

Mariumwebster نے لایعنیت کی تعریف یوں کی ہے:

Absurdism is the philosophical theory that existence in General is absurd. This implies that the world lacks meaning or a higher purpose and is not fully intelligible by reason.[۹]

۲۔ ادبی تعریف و مباحث:

لایعنیت ایک فلسفیانہ نظریہ ہے جس کے مطابق کائنات میں معنی یا عقلی وضاحت تلاش کرنے کی کوششیں بالآخر ناکام ہو جاتی ہیں۔ اور یہ کوششیں مضحکہ خیز ہیں کیونکہ کم از کم انسانوں کے لیے ایسا کوئی معنی موجود ہی نہیں ہے۔ اس تناظر میں مضحکہ خیز لفظ کا مطلب "منطقی طور پر ناممکن" نہیں ہے بلکہ "انسانی طور پر ناممکن" ہے۔ احمد سہیل نے اپنے مضمون "سرریلزم اور لایعنیت، مزاج ماہیت اور اصل مفاہیم کی آگاہی" میں لایعنیت کی تعریف یوں کی ہے:

"لایعنیت۔۔۔ Absurdism اسے لاپرواہ فلسفہ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسا فلسفہ ہے جس میں اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ کائنات افراتفری کا شکار ہے اور غیر معقول ہے اور کوئی بھی حکم نافذ کرنے کی کوئی بھی کوشش بالآخر ناکام ہو جائے گی۔ اس فلسفے کے رویّوں میں ناانصافی اور بدسلوکی کے ماحول کی ایسی تصاویر پیش کرنا شامل ہیں جو جان بوجھ کر مضحکہ خیز لغو اور لایعنی ہیں، اور یوں معاشرے کا مذاق اڑیا جاتا ہے"۔(۱۰)

آکسفورڈ ڈکشنری میں اس کی تعریف یوں کی گئی ہے کہ:

The belief that humans exist in a world with no purpose or order"-(۱۱)

۳۔ مغربی ادب اور اردو ادب میں "لایعنیت" کے مطالعات کی روایت:

آغاز و ارتقا:

لایعنیت کے متعلق سب سے پہلے انیسویں صدی میں "سورن کرکیگارڈ" نے قلم اٹھایا۔ سورن نے اپنی کتاب "Fear and Trembling" اور "The sickness unto death" میں لایعنیت کے بنیادی مباحث کا آغاز کیا۔

لایعنیت کی باقائدہ اصطلاح کا استعمال سب سے پہلے مارٹن اسلین martin esslin "نے اپنے مضمون The theatre of absurd میں کیا۔ یہ مضمون ۱۹۶۰ میں لکھا گیا۔ مارٹن نے چند منتخب کردہ ڈراموں کو "Absurd" کے نظریے کے تحت دیکھنے کی کوشش کی۔ بالکل اسی طرح جیسے کامیو نے "دی میتھ آف سیسی فس" (۱۹۴۲) میں لایعنیت کو بیان کیا۔ البرٹ کامیو نے وجودیت سے لاتعلقی کے بعد "دی میتھ آف سیسفس" کے نام سے مضمون شائع کیا۔ جس میں لایعنیت کا اظہار کیا گیا۔ "تھیٹر آف ابسرڈ" کا نظریہ وجودیت کی تھیوری کے زیرِ اثر منظرِ عام پر آیا۔ "تھیٹر آف آبسرڈ" نے حقیقی اور غیر حقیقی دنیا کو ایک ساتھ دیکھنے کی کوشش کی۔ مارٹن نے چار ڈرامہ نگاروں کو اس تحریک سے منسلک کیا ہے جن میں Samuel Beckett, Arthur adamov, Eugene Ionesco, اور Jean Genet کے نام اس نے شامل کیے ہیں۔ کچھ عرصے کے بعد مارٹن نے اس مضمون میں اضافہ کرتے ہوئے Harold Pinter کا نام شامل کیا۔

اس کے علاوہ ناقدین اس ضمن میں Edward Albee ,Boris Vian Tom Stoppard , Fernando Arrabal, Friedrich Durrenmatt اور Jean Tardieu کے نام شامل کرتے ہیں۔

لایعنیت کے عناصر:

ایسی تحریروں میں یہ دکھانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ زندگی بے معنی ہے۔ تمام جذبات احساسات سب بے معنی ہیں۔ ایسی تحریروں میں کوئی پلاٹ نہیں ہوتا بے تکی باتیں طنز کے انداز میں کی جاتی ہیں۔ لایعنیت کے متعلق کامیو کا خیال ہے کہ انسان اس بے معنویت کی حالت میں تین کام کر سکتا ہے:

- خودکشی(suicide)
- روحانی پناہ(philosophical suicide)
- اس بات پر یقین کیا جائے کہ life is absurd اور بنا کسی مقصد کے زندگی گزاری جائے۔
- جب انسان معنویت ڈھونڈتا ہے تو اس کے اور زندگی کے درمیان ایک تضاد کی فضا قائم ہوتی ہے۔

لایعنیت کے عناصر یہ ہیں:

۱۔ تضاد

۲۔ سیاہ مزاح

۳۔ بے معنی جملے

۴۔ بے تکا پلاٹ

لایعنیت سب سے زیادہ اس بات پر زور دیتی ہے کہ انسان بے بس ہے اور وہ انفرادی طور پر آزاد نہیں۔

لایعنی تحریروں میں اکثر ایسے کردار ہوتے ہیں جو زندگی اور کائنات کے وجود پر سوال اٹھاتے ہیں ایسی تحریروں کے کردار سمجھتے ہیں کہ ان کا وجود بنیادی طور پر بے معنی ہے اور اسی بے معنویت کو اجاگر کرنے کے لیے ان تحریروں میں مزاح اور طنز کا استعمال کیا جاتا ہے، ان تحریروں میں مزاح اور المیہ دونوں ہو سکتا ہے۔ یہ تحریریں مزاحیہ اور المناک دونوں ہو سکتی ہے کیونکہ یہ اکثر انسانی حالت کو اس طرح بیان کرتی ہیں

کہ تحریر میں مزاح اور درد دونوں عناصر موجود ہوتے ہیں۔ مزاح ان حالات کی مضحکہ خیزی سے آتا ہے جن میں کردار خود کو پاتے ہیں، جبکہ المیہ اس احساس سے آتا ہے کہ ان کا وجود بالآخر بے معنی ہے۔

سیاہ مزاح ایک ادبی تکنیک ہے جو معاشرتی مسائل یا انسانی برائیوں کو بے نقاب کرنے اور تنقید کرنے کے لیے مزاح اور طنز کا استعمال کرتی ہے۔ جو اکثر سنجیدہ یا ممنوع مضامین کے ساتھ اس طرح سے نمٹتی ہے جو مزاحیہ اور پریشان کن دونوں ہوتے ہیں۔

incongruity(عدم تناسب) ایک تکنیک ہے جو مزاح اور طنز پیدا کرنے کے لیے غیر متوقع یا غیر منطقی عناصر کا استعمال کرتی ہے۔ ڈوگلس ایڈمز کی " The Hitchhiker's Guide to the Galaxy" میں مرکزی کردار آرتھر ڈینٹ کو ایک دور دراز سیارے پر لے جایا جاتا ہے جہاں اسے پتہ چلتا ہے کہ ذہین مخلوق دراصل دیو اور بولتے چوہے ہیں۔ یہ تضاد کی ایک مثال ہے، کیونکہ یہ غیر متوقع اور غیر منطقی ہے۔ دلیل کی نفی لایعنیت کا ایک اہم موضوع ہے، جو اکثر انسانی حالت کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ وہ بنیادی طور پر غیر معقول اور بے معنی ہے۔ زندگی کی بے معنویت لایعنیت کا بنیادی موضوع ہے۔ یہی وہ بنیادی مسئلہ تھا جس نے عدمیت، لایعنیت اور وجودیت کو جنم دیا۔

لایعنی ناول کی ایک مشہور مثال البرٹ کامیو کا "The Stranger" ہے۔ اس ناول میں مرکزی کردار مرسو ایک بے حس آدمی ہے جو خود کو قتل کے ایک مقدمے میں پھنسا ہوا پاتا ہے۔ ایک اور مثال سیموئیل بیکٹ کی "waiting for the godot" ہے، جس میں دو ایسے کردار ہیں جو Godot نامی شخص کے لیے لامتناہی انتظار کرتے ہیں، لیکن حقیقت میں اس سے کبھی نہیں ملتے۔ دونوں تحریروں میں انسانی حالت اور وجود کی بے معنویت کو تلاش کرنے کے لیے لایعنیت کا استعمال کیا گیا ہے۔

طنز: " the stranger" میں البرٹ کامیو نے قانونی نظام اور مرسو پر قتل کے مقدمے کی بے معنویت پر تنقید کرنے کے لیے طنز کا استعمال کیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اس مقدمے میں مرسو کو اس کی بے حسی اور سماجی اصولوں سے مطابقت نہ ہونے کی وجہ سے اسے مجرم ٹھہرایا جاتا ہے نا کہ قتل کی وجہ سے۔

سیاہ مزاح: سیموئیل بیکٹ کا "waiting for the godot" سیاہ مزاح سے بھرا ہوا ہے۔ مثال کے طور پر، کردار بے معنی گفتگو اور بے مقصد سرگرمیوں میں مشغول رہتے ہیں، جیسے بار بار اپنی ٹوپیاں اتارنا اور پہننا۔ ان مضحکہ خیز حرکتوں کا مقصد مزاحیہ اور پریشان کن دونوں ہوتا ہے۔

د۔ "عدمیت"، "لایعنیت" اور "وجودیت" کے فکری افتراقات

انیسویں صدی میں سائنس کو بہت زیادہ اہمیت دی جانے لگی۔ ڈارون اور مختلف سائنسدانوں نے دنیا کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنا شروع کیا۔ اس دور میں یقین faith سے زیادہ عقلی مشاہدات پر یقین کیا جانے لگا۔ مذہبی روایات جو صدیوں سے چلی آ رہی تھیں انہیں شک کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔ یہی وہ دور تھا جب انسان بے یقینی کی کیفیت سے دوچار ہونے لگا اس کے ذہن میں مختلف سوالات جنم لینے لگے۔ زندگی کا مقصد کیا ہے ؟ مرنے کے بعد ہم کہاں جائیں گے ؟ انہی سوالات نے انکار پر مبنی تھیوری عدمیت یعنی نہلزم کو جنم دیا۔ جس کا باقاعدہ اظہار ناول باپ اور بیٹے میں کیا گیا۔ یہی وہ ذہنی کیفیت تھی جس کی بدولت تمام روایات، اقدار اور تصورات کو رد کرتے ہوئے ایک فلسفانہ نظریے کو فروغ دیا گیا۔ جسے عدمیت کا نام دیا گیا۔

انیسویں صدی میں جدیدیت اور عدمیت عروج کو پہنچی اور ان کی پختگی نے مذہبی نظریات کو شک کی نگاہ سے دیکھنا شروع کیا اور اس نتیجے میں معنویت کے بحران نے جنم لیا۔ جسے عدمیت یعنی نہلزم کا نام دیا گیا چنانچہ عدمیت کے ظہور نے فلسفیوں کو ایک بار پھر سنجیدگی سے یہ سوال کرنے پر اکسایا کہ زندگی کا کیا مطلب ہے ؟ یہی وہ سوال تھا جو صدیوں سے اٹھایا جا رہا تھا۔ یہی سوال تین رجحانات سامنے لے کر آیا۔ سب سے پہلا اور بنیادی مسئلہ تھا عدمیت یعنی یہ احساس کہ زندگی بے معنی ہے اس زندگی کے کوئی معروضی معنی نہیں۔ اسی مسئلے کے دو حل ہمارے سامنے آئے۔ وجودیت اور لایعنیت۔

لایعنیت دو چیزوں کے بارے میں بتاتی ہے اس کے نزدیک ایک طرف سرد بے حس اور بے معنی معروضی حقیقت اور دوسری طرف معنی کے لئے انسانیت کی موروثی تحریک۔ لایعنیت کا رجحان زندگی میں ہماری معنویت کی بھوک کے احساس سے پیدا ہوتا ہے جو بے معنی ہے۔ یہ معنی کی بھوک اور اسے مطمئن کرنے کی ناممکنیت کے درمیان تناؤ ہے۔ ہم سب اس لایعنی تناؤ میں ڈوبے ہوئے ہیں اور کامیو کے مطابق اس مسئلے سے نمٹنے کے لیے ہمارے پاس تین متبادل ہیں: پہلا آپشن خودکشی کرنا ہے۔ اگر زندگی کا کوئی مطلب نہیں ہے تو پھر ہم کیوں زندہ رہیں؟ کامیو کو یہ آپشن غیر تسلی بخش معلوم ہوتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ موت میں زندگی سے زیادہ کوئی معنی نہیں ہے اور یہ صرف اس مسئلے سے بچنے کا حل نہیں ہے۔ دوسرا آپشن یہ ہے کہ کسی مذہب یا نظریے پر یقین کر لیا جائے یا اس میں پناہ لے لی جائے اور اسے اپنا مقصدِ حیات بنا لیا جائے جو ہمیں یہ

بتائے کہ زندگی کا یہ مطلب ہے اور جس پر ہمیں یقین ہو۔ یہ عیسائیت جیسا مذہب اور مارکسزم جیسا نظریہ ہو سکتا ہے۔ اس حل کو بھی کامیو غیر تسلی بخش سمجھتا ہے۔ کامیو اس آپشن کو فلسفانہ خودکشی سے تعبیر کرتا ہے۔ اسے یہ دونوں حل بے معنی اور غیر تسلی بخس لگتے ہیں اس لیے اس نے ایک تیسرا آپشن تجویز کیا ہے کہ اس بات پر یقین کیا جائے کہ life is absurd اور بنا کسی مقصد کے زندگی گزاری جائے۔ جب انسان معنویت ڈھونڈتا ہے تو اس کے اور زندگی کے درمیان ایک تضاد کی فضا قائم ہوتی ہے۔ لایعنیت بے معنویت کے خلاف بغاوت ہے۔ ہم موت یا فلسفانہ خودکشی کے ذریعے بے معنویت سے بچ نہیں سکتے۔ لایعنیت ہمیں ایک ایسی زندگی کی طرف اکساتی ہے جس کی خصوصیت اس کی اپنی اخلاقیات اور اس کی حدود کے خلاف شدید شعور اور بغاوت ہوتی ہے۔ کامیو وجودیت پسندوں کے نظریات کو رد کرتا ہے جسے وہ بالآخر ان کی فراریت اور غیر معقولیت کے طور پر دیکھتا ہے، یہ کہتے ہوئے کہ وہ ان چیزوں سے انکار کرتے ہیں جو انہیں کچل دیتی ہے اور ان میں بہتری لانے کی امید کی وجہ تلاش کرتے ہیں۔ یہ جبری میدان سب میں مذہبی ہے۔ لایعنیت کا مطلب ہے زندگی کی بے معنویت کو قبول کرنا اور اس دنیا کو لغو سمجھنا ہے۔ ہمارے معنی کی بھوک کی اس جھوٹی تسکین کے خلاف لایعنیت باغی ہے۔ اس کے بجائے کامیو کہتا ہے کہ ہمیں تناؤ کو تھامنا چاہیے، بے معنی کی جگہ کو قبول کرنا چاہیے۔ جیسا کہ وہ کہتا ہے کہ ایک غیر آزاد دنیا سے نمٹنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ آپ بالکل آزاد ہو جائیں کہ آپ کا وجود ہی بغاوت کا عمل ہے۔ کامیو کا لایعنیت کا فلسفہ ایک ایسی تصویر میں بہترین طور پر عکاسی کرتا ہے جو کہ افسانوی شخصیت سیسیفس کی ہے۔ اس کی تین وجوہات ہیں جن کی وجہ سے سسیفس کامیو کی لایعنیت کی علامت ہے۔ انڈرورلڈ سے باہر نکلنے اور ایک بار پھر دنیا کی لذت سے لطف اندوز ہونے کے لئے واپس لوٹنے کے ذریعے اس کی زندگی سے محبت ہے جو کہ زندگی سے انکار کرنے والے عدمیت کے نظریے کے سخت خلاف ہے۔ دوسرا سیسفس کی سزا ہے۔ ایک چٹان کو پہاڑی پر لڑھکنے کی بے معنویت صرف یہ دیکھنے کے لئے کہ اسے دوبارہ نیچے لڑھکنا ہے اور ناگزیر نتائج کو جانتے ہوئے بھی ہر بار اسے دوبارہ اوپر دھکیلنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ سیسیفس لایعنیت کے ایک ابدی چکر میں پھنس گیا ہے۔ تیسرا سبب سیسیفس کامیو کی لایعنیت کا مجسمہ ہے کہ وہ باغی ہے۔ وہ موت اور دیوتاؤں کو زندہ رہنے کے لیے پیچھے چھوڑ دیتا ہے۔ وہ بنیادی نظریات کے خلاف بغاوت کرتا ہے وہ دیوتاؤں کے خلاف بغاوت کرتا ہے۔ یہ تمام نکات کامیو کی عظیم لائن

میں اکٹھے ہوتے ہیں جو اس کی کتاب کے اختتام میں ہے: میں پہاڑ کے دامن میں سیسیفس کو چھوڑتا ہوں! وہ ایک بار پھر بوجھ تلاش کرتا ہے. لیکن سیسیفس اعلی وفاداری سکھاتا ہے جو دیوتاؤں کی نفی کرتا ہے اور پتھروں کو اٹھاتا ہے۔ وہ بھی یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ سب ٹھیک ہے۔

لہذا لایعنیت زندگی کے معنی تلاش کرنے کے بارے میں نہیں ہے بلکہ زندگی کی لغویت کے خلاف بغاوت کرنے کے بارے میں ہے، یہ معنی تلاش کرنے کے مطالبے سے الگ رہنا ہے، خود اس مضحکہ خیز کھیل کے خلاف بغاوت کرنا اور زندگی کی تصدیق کرنا ہے۔ یہ سالمیت کے ساتھ جدوجہد کرنا ہے کیونکہ بلندیوں کی طرف یہ جدوجہد آدمی کے دل کو بھرنے کے لئے کافی ہے۔ بے معنویت کے بحرانوں کا سامنا کرتے ہوئے جو کہ عدمیت پیش کرتی ہے، لایعنی شخص خودکشی نہیں کرتا اور خود کو ہلاک نہیں کرتا، وہ مضحکہ خیز زندگی کے قریب ترین بیڑے کو پکڑ کر فلسفانہ خودکشی نہیں کرتا۔ لایعنیت پسند جدوجہد کی تصدیق کرتا ہے اور اس کے لیے زندگی سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ وہ خود کو سسیفس کی طرح خوش تصور کرنا چاہتا۔

عدمیت یہ احساس ہے کہ کوئی معروضی معنی نہیں ہے۔ وجودیت اس کا جواب یہ کہہ کر دیتی ہے کہ ہم اپنی زندگی میں جو انتخاب کرتے ہیں اس کے ذریعے اپنا مطلب پیدا کرنا ممکن ہے۔ دوسری طرف لایعنیت کہتی ہے کہ ہمیں اپنا مطلب خود پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہئے بلکہ ہمیں اس بے معنویت کے سامنے جھانک کر بغاوت کرنی چاہیے۔

مختصراً یہ کہ عدمیت نے جس بحران کو جنم دیا لایعنیت اور وجودیت اس بحران کے حل کے طور پر سامنے آئیں۔

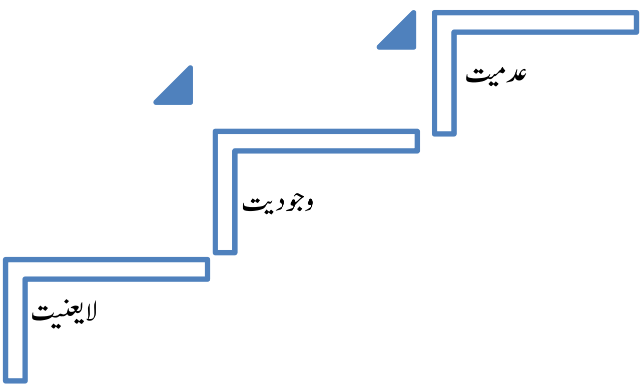

یہ تینوں تھیوریز ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ عدمیت زندگی کو بے معنی سمجھتی ہے اور اس کے نزدیک کسی چیز اور کسی نظریے کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ وجودیت اس کا حل بتاتی ہے کہ سب سے اہم انسان کا وجود ہے اور زندگی کے معنی وہی ہیں جو انسان اپنے اعمال کے ذریعے اسے دیتا ہے۔ جبکہ لایعنیت کہتی ہے کہ زندگی بے معنی ہے اور اس میں معنی تلاش کرنا مضحکہ خیز ہے لہٰذا یہ جیسی ہے اسے ویسے ہی قبول کرنا چاہیے کیونکہ جب ہم اپنی زندگی میں معنویت کی تلاش کرتے ہیں تو معاشرے اور ہمارے درمیان تضاد کی فضا پیدا ہوتی ہے۔

ان تینوں تھیوریز کا تعلق زندگی کی بے معنویت سے ہے۔ تینوں کے نظریات زندگی کی بے معنویت کے متعلق ہیں۔ اسی لیے انہیں اکثر ایک ہی نظریہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ اکثر مفکرین ان تینوں سے وابسطہ ہوتے ہیں جس کی وجہ سے یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے۔ اردو ادب میں بھی اکثر ان تینوں نظریات کو ایک ہی تھیوری کا جز سمجھا جاتا ہے۔ خاص طور پر لایعنیت اور وجودیت کو ایک ہی نظریہ سمجھا جاتا ہے۔ مختصراً یہ کہ ان تینوں میں واضح فرق موجود ہے۔ یہ تینوں اپنے الگ نظریات پیش کرتی ہیں اور زندگی کی بے معنویت کے بارے میں مختلف نظریات بیان کرتی ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ نہلزم،iep.utm.edu ، ۱۲/ اکتوبر ۲۰۲۲ء، بہ وقت ۳ بجے دن

۲۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، قومی انگریزی لغت، مقتدہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۰، ص ۱۳۱۴

۳۔ Gideon Baker, Nihilism and philosophy, Bloomsbury academic, united kindom,2018,p80

۴۔ نہلزم،www.britannica.com ، ۱۴/ اکتوبر ۲۰۲۲ء، بہ وقت ۵ بجے دن

۵- Karen L Carr,The Benalization of nihilism , state university of new yorkpress,1992,p50

۶۔ ایضاً، ص ۵۴

۷۔ Nolen gertz , nihilism,The MIT Cambridge

massachusessetts,London,2019 p40

۸- Karen L Carr,The Benalization of nihilism , state university of new yorkpress,1992,p54

۹۔ ابسرڈازم،www.merriam-webster.com ، ۱۲/ اکتوبر ۲۰۲۲ء ، بہ وقت ۳ بجے دن

۱۰۔ احمد سہیل، مضمون، سرریلزم اور لایعنیت، مزاج ماہیت اوراصل مفاہیم کی آگاہی،

www.punjnud.com، ۱۰/ اکتوبر ۲۰۲۲ء، بہ وقت ۲ بجے دن

۱۱۔ ابسرڈازم،www.oed.com ، ۱۸/ اکتوبر ۲۰۲۲ء، بہ وقت ۷ بجے دن

باب دوم :

انیس ناگی کے ناولوں میں "عدمیت" کے اثرات کا جائزہ:

(دیوار کے پیچھے، میں اور وہ، زوال)

انیس ناگی کا تعارف:

انیس ناگی ۱۱ فروری ۱۹۳۹ کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ انیس ناگی کے آباؤ اجداد کا تعلق امر تسر سے تھا۔ ان کے والد کا نام مولوی ابراہیم تھا۔ ان کے والد ایک دیندار آدمی تھے۔ وہ مذہب کو عقلی نقطہ نگاہ سے دیکھتے تھے۔ انہیں قرآن کی تلاوت کا بہت شوق تھا۔ انہوں نے ایک چھوٹا سا کتابچہ "قرآن کیوں اترا" اور ایک پمفلٹ حجرِ اسود شائع کروا کر تقسیم کروایا۔ انہوں نے تین شادیاں کی تھیں۔ انیس ناگی کی والدہ ان کی تیسری بیوی تھیں۔ مولوی ابراہیم دورانِ ملازمت جوڈیشل آفیسر کی حیثیت سے مختلف مقامات پر ملازمت کرتے رہے، آخری عمر لاہور میں بسر کی، کچھ عرصہ ایک کمپنی کے مشیر بھی رہے۔ انیس ناگی کی والدہ ایک سیدھی سادھی ناخواندہ عورت تھیں جو عمر میں اپنے شوہر سے کافی چھوٹی تھیں۔ وہ تین سوتیلے بیٹوں اور دو سوتیلی بیٹیوں کی وجہ سے ہمیشہ اپنی اولاد کے لیے سوالیہ نشان ہی رہیں۔ انیس ناگی کی سرگزشت میں ان کے پانچ بہن بھائیوں کا تذکرہ ملتا ہے۔

انیس ناگی کا بچپن چھ شہروں میں گزرا۔ ان کی زندگی کا سفر سیالکوٹ سے شروع ہوا۔ روہتک میں ان کی تعلیم کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ جب آپ پانچ برس کے ہوئے تو آپ کو لدھیانہ کے اسلامیہ سکول میں داخل کیا گیا۔ اسی دوران تحریک ہندوستان زور پکڑنے لگی۔ جس کی بدولت آپ کے والد کا تبادلہ جالندھر ہو گیا۔ پھر آپ نے گورنمنٹ ہائی سکول جالندھر میں اپنی تعلیم جاری رکھی۔ تقسیم ہندوستان کے بعد آپ لاہور میں رہائش پذیر ہوئے۔ لاہور میں سنٹرل ماڈل ہائی سکول میں ان کو داخل کروایا گیا۔ اس کے بعد آپ کے والد کا تبادلہ میانوالی ہو گیا۔ آپ نے وہاں کے گورنمنٹ سکول میں داخلہ لیا۔ وہی پر انہوں نے غور و فکر شروع کیا۔

انہوں نے لاہور کے گورنمنٹ سکول اور کالج سے میٹرک اور انٹر میڈیٹ کی تعلیم حاصل کی۔اس کے بعد ایم اے اردو لاہور کے اورینٹل کالج سے کیا اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری جامعہ پنجاب سے کی اور انہیں گولڈ میڈل بھی ملا۔اس کے بعد انہوں نے گورنمنٹ کالج لاہور اور فیصل آباد میں بطور لیکچرر کام کیا۔میگزین روای کے مدیر بھی رہے جو گورنمنٹ کالج لاہور سے نکلتا تھا۔کچھ عرصے بعد ناگی نے مقابلے کا امتحان پاس کیا ۔ڈپٹی سیکرٹری ایجوکیشن سمیت مختلف سرکاری عہدوں رہے۔1999 ء میں وہ بورڈ آف ریونیو کے ادارے میں کام کرتے رہے اور اسی دوران ریٹائر ہوئے۔۷ اکتوبر ۲۰۱۰ کو پنجاب پبلک لائبریری میں کتاب پڑھنے کے دوران دل نے کام کرنا چھوڑ دیا اور آپ وفات پا گئے۔

انیس ناگی کی ناول نگاری:

انیس ناگی کا شمار جدید دور کے ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔انیس ناگی اپنے ناولوں میں جدید دور کے سیاسی اور فکری بحران کو وجوی فکر سے ہمکنار کرتے ہیں۔انیس ناگی نے ہی اردو ناول کو کافکا،سارتر اور کامیو سے متعارف کروایا۔انیس ناگی فلسفہ وجویت کے شدید قائل تھے۔ان کی تحریروں میں انفرادی آزادی پر بہت زور دیا گیا ہے۔ان کے ناولوں میں فرد کی آزادی،سماج کی تلخیاں،معاشرتی مسائل،انفرادی آزادی اور زندگی کی بے معنویت جیسے موضوعات نظر آتے ہیں۔انیس ناگی کے ناولوں کا ہیرو ایک باغی ہیرو ہے جو تمام روایات کو توڑ کر اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزارنا چاہتا ہے لیکن معاشرہ اسے اپنی روایات میں جکڑے ہوئے ہے۔انیس ناگی نے بارہ ناول تحریر کیے ہیں۔جن میں دیوار کے پیچھے،میں اور وہ،زوال،ایک گرم موسم کی کہانی،ایک لمحہ سوچ کا، محاصرہ ، قلعہ ، چوہوں کی کہانی ،کیمپ ،پتلیاں،ناراض عورتیں،۳۱۳بریگیڈ اور فصیلیں(مجموعہ چار ناول)شامل ہیں۔

ان کے ناول دیوار کے پیچھے، میں اور وہ اور زوال لایعنی اور وجودی ناول ہیں ۔ ان ناولوں میں انفرادی آزادی پر زور دیا گیا ہے۔ان ناولوں میں بے معنویت دکھائی دیتی ہے۔یہ پروان چڑھنے والی نئی نسل کے ترجمان ہیں۔ایک لمحہ سوچ کا اور محاصرہ دونوں تاریخی ناول ہیں۔ایک گرم موسم کی کہانی یہ ناول جنگ آزادی کے متعلق ہے۔ایک لمحہ سوچ کا یہ سقوط دہلی کے متعلق ہے۔محاصرہ یہ بھی پاکستانی تاریخ پر مبنی ہے۔ قلعہ میں لاہور کو ایک جہنمی شہر کہا گیا۔اس ناول میں لاہور کا المیہ بیان کیا گیا ہے۔چوہوں کی کی کہانی طاعون

کی وبا سے متعلق ہے۔ناول کیمپ میں سوویٹ یونین اور افغانستان کی جنگ کے نتیجے میں پاکستان ہجرت کر کے آنے والے مہاجرین اور ان کے پاکستان میں قائم کردہ کیمپوں کی زندگی کا احاطہ کیا گیاہے ۔ناول ناراض عورتیں یہ جنسی کمزوریوں کے شکار مردوں کی کہانی بیان کرتا ہے ۔ انیس ناگی نے جدید نظریات کو اپنی تحریروں کا موضوع بنایا۔ انیس ناگی نے خود کلامی جیسی تکنیک استعمال کی ۔ انہوں نے اردو ناول کو نئے رجحانات سے ہمکنار کیااسی لیے انیس ناگی کو اردو ناول نگاری میں اہم مقام حاصل ہے۔

دیوار کے پیچھے:

یہ ناول ۱۹۷۰ میں لکھا گیا۔لیکن اس کا سنِ اشاعت ۱۹۸۰ ہے۔اسے فیروز سنز نے شائع کیا۔اس کی دوسری اشاعت ۱۹۸۸ میں ہوئی۔اس ناول میں پاکستانی فرد کی کہانی ہے جس کا تعلق ایک متوسط طبقے سے ہے ۔اس ناول کا مرکزی کردار پروفیسر معاشرے میں موجود ناانصافیوں، انسان کے ہاتھوں دوسرے انسان کی تذلیل، انسان کا استحصال، بے حس نظام کے خلاف بغاوت اور ان گنت مسائل کے خلاف انفرادی سطح پر آواز بلند کرتا ہے۔ ایسا انقلابی شخص معاشرے کو قبول نہیں۔چنانچہ معاشرہ ایسے شخص کو نفسیاتی اور ذہنی تشدد کا شکار کر دیتا ہے۔

اس ناول کی کہانی ایک ایسے پروفیسر کے گرد گھومتی ہے جو بلا جھجک اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ جس کے نتیجے میں اسے نوکری سے نکال دیا جاتا ہے۔کچھ اسے چھیڑ کر محظوظ ہوتے ہیں، کچھ اسے بیرونی ایجنٹ سمجھتے ہیں اور تو کچھ اسے کمیونسٹ ۔یہی وہ وجوہات تھیں جن کی بنا پر اسے نوکری سے نکال دیا جاتا ہے۔اس کے گھر والے بھی اس سے تنگ ہوتے ہیں۔ پروفیسر ان موضوعات پر سوالات اٹھاتا ہے جن پر بات کرنا ممنوع ہوتا ہے۔ اسی لیے سب آہستہ آہستہ اس سے دور ہو جاتے ہیں۔ وہ اکیلا رہ جاتا ہے کیوں کہ کوئی اس نظام کو بدلنا نہیں چاہتا ہے۔پہلے وہ مزاحمت کرتا ہے پھر وہ آہستہ آہستہ اس زوال کا حصہ بن جاتا ہے۔تب اسے پتا چلتا ہے کہ معاشرے کا جبر کیسے ایک فرد کو متاثر کرتا ہے۔اس جبر کی بدولت وہ خودکشی بھی کرنا چاہتا ہے لیکن وہ اس میں بھی ناکام ہو جاتا ہے۔

میں اور وہ:

اس میں بھی دیوار کے پیچھے کی طرح کا ہی ایک کردار ہے جو بے معنویت اور قنوطیت کا شکار ہے۔ یہ بھی معاشی روایات کا باغی ہے۔ یہ بھی ہر جگہ نامراد دکھائی دیتا ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار میں کا صیغہ ہے ۔ وہ ایک گورنمنٹ ملازم ہے جو انتہائی بے بس دکھائی دیتا ہے اس کی بیوی بھی اس سے بے زار ہے۔ وہ خود بھی ان تمام رشتے ناطوں سے اکتایا ہوا ہے۔ وہ ایک ایسے سماج میں رہتا ہے جو اسے جینے نہیں دیتا وہ اس کا جانی دشمن ہے اور اسے اپنی مرضی کے مطابق چلانا چاہتا ہے۔ یہ معاشرہ ایسا معاشرہ ہے جو اپنے شہریوں کو کچلنا چاہتا ہے۔ جب مرکزی کردار ایسی صورت حال میں الجزائر جاتا ہے تو اس کے خلاف انکوائری شروع ہو جاتی ہے۔ اس کی بیوی بھی اسے کہتی ہے کہ تم بنا بتائے کیوں گئے تمھیں محکمے کو آگاہ کرنا چاہیے تھا۔ اس پہ وہ ہنس دیتا ہے۔ یہ حالات کا مارا ہوا ہے۔

ان کے مرکزی کرداروں کے حوالے سے انیس ناگی کی "میں اور وہ" اور "دیوار کے پیچھے" میں ماحول اور حالات سے ناراضی اور نفرت بے وجہ نہیں ہے۔ وہ بچپن میں بہن بھائیوں کی وافر تعداد میں ایک ادھوری موجودگی اور اپنے والد کے بے حد درشت رویے سے پریشان رہے۔ جن کے اثرات ان کے ناولوں میں دکھائی دیتے ہیں۔

زوال:

مصنف کے ناول زوال کی کہانی مرکزی کردار احسن کے گرد گھومتی ہے وہ ایک سرکاری ملازم ہے جسے ایک بیماری لاحق ہے۔ وہ معاشی مسائل کا بھی شکار ہے اس کی بیوی ایک استانی ہے۔ دونوں بڑی مشکل سے گھر کا خرچ چلا رہے ہیں اور اوپر سے احسن کی یہ بیماری۔ اس ناول میں مرکزی کردار کے زوال کی کہانی دکھائی گئی ہے۔ یہی وہ زوال ہے جو احسن کو مذہب، اخلاقیات اور اور سیاسی نظام سے بغاوت پر اکساتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ سب بے معنی ہیں اور اس کا وجود بھی۔ وہ ان سب چیزوں سے فرار چاہتا ہے لیکن وہ موت سے بھی ڈرتا ہے۔ کہانی میں سیاسی حالات بھی دکھائے گئے ہیں جو ڈھکے چھپے الفاظ میں مارشل لاء کے دور کے بہترین عکاس ہیں۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ اس دور میں کس طرح سے انسان بے معنویت، قنوطیت اور بے بسی کی طرف جاتا ہے۔ احسن کے دونوں دوست انسانی حقوق کی بات کرتے ہیں اسی لیے ان میں سے ایک کو

مار دیا جاتا ہے جبکہ دوسرا حادثے کا شکار ہو جاتا ہے۔ ناول کے اختتام میں احسن کی آنکھ بھی خراب ہو جاتی ہے ۔ جو زوال کی علامت دکھائی گئی۔ احسن اپنی اس حالت کا ذمے دار معاشرے اور معاشرتی اداروں کو سمجھتا ہے ۔ جس نے اسے اس حد تک پہنچا دیا کہ اب اس کا اپنا وجود بھی بے معنی ہو گیا ہے۔ وہ خود کو بے بس اور لاچار سمجھتا ہے۔ اور یہ بے بسی اسی معاشرے اور اس کے نظام کی دین ہے جس کی بدولت اس کے وجود کی کوئی وقت نہیں رہی۔ یہی سے لایعنیت اور عدمیت کے نظریات ناول سے جڑتے ہیں۔ یہ ناول لایعنیت اور عدمیت کے نظریات کو سامنے لاتا ہے۔ مارشل لاء کی وجہ سے پیش آنے والے مسائل، ظلم، بے بسی، بے معنویت وغیرہ جیسے اہم موضوعات اس ناول میں موجود ہیں۔

انیس ناگی کے ناولوں میں "عدمیت" کے اثرات کا جائزہ:

انیس ناگی دورِ جدید کے مشہور ناول نگار ہیں۔ انیس ناگی مغربی مفکرین سے بہت متاثر تھے۔ انہوں نے کچھ مغربی مفکرین کی تحریروں کا ترجمہ بھی کیا ہے۔ انیس ناگی کے ناولوں میں جہاں وجودیت اور لایعنیت کے اثرات دکھائی دیتے ہیں وہیں عدمیت کے بھی گہرے اثرات موجود ہیں۔ دیوار کے پیچھے، میں اور وہ اور زوال میں عدمیت کی مختلف اقسام کے اثرات دکھائی دیتے ہیں جن میں سب سے زیادہ سیاسی عدمیت، اخلاقی عدمیت اور وجودی عدمیت نمایاں ہیں۔

ا۔ سیاسی عدمیت:

سیاسی عدمیت ایک فلسفانہ نظریہ ہے جو روایتی سیاسی اقدار اور اداروں کو مسترد کرتا ہے۔ یہ اس بنیاد پر مبنی ہے کہ یہ اقدار اور ادارے بے معنی ہیں اور ان کا کوئی موروثی معنی یا قدر نہیں ہے۔ سیاسی عدمیت پسندوں کا خیال ہے کہ سیاسی اقدار کی کوئی معروضی بنیاد نہیں ہے، اور ایسی بنیاد بنانے کی کوئی بھی کوشش بے کار ہے۔ سیاسی عدمیت کو اکثر انارکزم کے ساتھ منسلک کر دیا جاتا ہے، جو ایک سیاسی فلسفہ ہے جو حکومت اور اختیار کی تمام اقسام کے خاتمے کی وکالت کرتا ہے۔ تاہم سیاسی عدمیت بنیادی طور پر انارکزم کا مترادف نہیں ہے اور سیاسی عدمیت کی بہت سی مختلف تشریحات ہیں۔ کچھ سیاسی عدمیت پسندوں کا خیال ہے کہ حقیقی آزادی حاصل کرنے کا واحد طریقہ اختیار کی تمام اقسام کو

مسترد کرنا اور انفرادیت اور مفاد پرستی پر مبنی معاشرہ تشکیل دینا ہے۔ کچھ کا خیال ہے کہ سیاسی عدمیت ایک منصفانہ اور مساوی معاشرے کی تشکیل کی طرف ایک ضروری قدم ہے اور یہ جمود کو چیلنج کرنے اور بنیادی تبدیلی کو فروغ دینے کا ایک طریقہ ہے۔ سیاسی عدمیت کے ناقدین کا کہنا ہے کہ یہ ایک خطرناک اور تباہ کن فلسفہ ہے جو افراتفری اور تشدد کا باعث بن سکتا ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ اقدار اور اداروں کے مشترکہ سیٹ اپ کے بغیر معاشرہ کام کرنے سے قاصر رہے گا اور سیاسی عدمیت بالآخر تہذیب کے ٹوٹنے کا باعث بنے گی۔ مجموعی طور پر سیاسی عدمیت ایک پیچیدہ اور متنازعہ فلسفہ ہے جو برسوں سے بہت زیادہ بحث و مباحثے کا موضوع رہا ہے اور اس کی بہت سی مختلف تشریحات موجود ہیں۔

جے ڈی سیلنگر کے ناول "The Catcher in the Rye"" میں ہولڈن کالفیلڈ کی کہانی بیان کی گئی ہے، یہ ایک مایوس کن نوجوان ہے جو معاشرے کی اقدار اور اداروں کو مسترد کرتا ہے۔ ہولڈن کو سیاسی عدمیت کی علامت کے طور پر دیکھا جاسکتا ہے اور اس ناول کا تعلق ۱۹۶۰ کی دہائی کی counter culture تحریکوں سے تھا۔ البرٹ کامیو کے ناول اجنبی میں سیاسی عدمیت کے نظریات موجود ہیں ۔یہ ناول Meursault نامی ایک جذباتی طور پر الگ تھلگ آدمی کی زندگی کے متعلق ہے جس پر قتل کا الزام ہے۔ ناول میں اخلاقی روایات اور سیاسی اداروں پر تنقید کی گئی ہے اور یہ وجودیت اور سیاسی عدمیت سے منسلک دکھائی دیتا ہے۔ جیسے مرسو کہتا ہے کہ میرے پاس صرف تھوڑا وقت بچا تھا اور میں اسے خدا پر ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ناول کے مرکزی کردار مرسو کی طرف سے کہی گئی یہ عبارت روایتی اخلاقیات اور سیاسی اداروں کو مسترد کرنے کی عکاسی کرتی ہے۔ Meursault دنیا کو بے معنی اور لغو سمجھتا ہے اور وہ کسی اعلیٰ طاقت یا مقصد پر یقین نہیں رکھتا ہے۔ البرٹ کامیو کا ایک اور ناول " طاعون " میں بھی سیاسی عدمیت کے نظریات دکھائی دیتے ہیں۔ مثلاً اس کا مرکزی کردار کہتا ہے دنیا میں برائی تقریباً ہمیشہ جہالت سے آتی ہے اور خیر خواہی اتنا ہی نقصان پہنچا سکتی ہے جتنا کہ بدنیتی اگر روشن خیال نہ ہو۔ ناول کے ایک کردار کے ذریعے بولا جانے والا یہ جملہ آمریت اور فاشزم پر تنقید کرتا ہے۔ ناول میں کہا گیا ہے کہ سیاسی ادارے اور نظریات اتنے ہی خطرناک ہو سکتے ہیں جیسے بیماری یا قدرتی آفات۔ البرٹ کامیو کے ناول "طاعون" میں وہ کہتا ہے کہ طاعون کی بیماری کبھی نہیں مرتی ہے اور نہ ہی یہ غائب ہوتی ہے۔ یہ فرنیچر اور کتان کے سینے میں سالوں تک غیر فعال رہ سکتی ہے؛ یہ

سونے کے کمرے، تھانے، تنوں اور کتابوں کی الماریوں میں اپنا وقت گزارتی ہے؛ اور شاید وہ دن آئے جب انسانوں کی بھلائی اور روشن خیالی کے لیے یہ اپنے چوہوں کو پھر سے اٹھائے گا اور انہیں ایک شہر میں مرنے کے لیے بھیج دے گا۔ناول کے آغاز میں کہے گئے یہ الفاظ سیاسی عدمیت اور انسانی حالت کی عکاسی کرتے ہیں۔ناول میں کہا گیاہے کہ دنیا غیر متوقع ہے اور انسان ان کے قابو سے باہر کی قوتوں کا شکار ہے۔

Fyodor Dostoevsky کا تحریر کردہ ناول "Notes from Underground" یہ ناول وجودیت پسند ادب کی ایک بہترین مثال ہے اور اس میں بیگانگی، مایوسی، اور سیاسی عدمیت کے موضوعات کو بیان کیا گیا ہے۔ راوی ایک ایسا آدمی ہے جس نے معاشرے کی اقدار اور اداروں کو مسترد کر دیا ہے اور جو ایک ایسی دنیا میں معنی تلاش کرنے کی جدوجہد کر رہا ہے جسے وہ بے معنی سمجھتا ہے۔

Chuck palahnik کا "فائٹ کلب اس حوالے سے اہمیت کا حامل ہے۔ یہ ناول ایک نامعلوم راوی کی کہانی کی پیروی کرتا ہے جو بیگانگی اور مایوسی کے جذبات سے نبرد آزما ہے۔ وہ مردوں کے ایک گروپ کے ساتھ شامل ہو جاتا ہے جو لڑنے کے لیے خفیہ طور پر ملتے ہیں اور ناول سیاسی عدمیت کے موضوعات کے متعلق ہے۔ بریٹ ایسٹن ایلس کے ناول "امریکن سائیکو" میں بھی سیاسی عدمیت کے نظریات کو پیش کیا گیا ہے۔ یہ ناول پیٹرک بیٹ مین نامی ایک امیر سرمایہ کاری بینکر کی کہانی کی پیروی کرتا ہے جو ایک سیریل کلر بھی ہے۔ناول میں سیاسی نظام پر تنقید کی گئی ہے۔ فرانز کافکا کا ناول "مقدمہ" بھی سیاسی عدمیت کے حوالے سے اہم ہے مثلاً جیسے اس کا مرکزی کردار کہتا ہے کہ یہ صرف ان کی حماقت کی وجہ سے ہے کہ وہ اپنے آپ پر اتنا یقین کرنے کے قابل ہیں۔ ناول کے مرکزی کردار جوزف کی طرف سے کہے گئے یہ الفاظ روایتی اتھارٹی اور سیاسی اداروں کو مسترد کرتے ہیں۔ جوزف دنیا کو بے معنی سمجھتا ہے، اور وہ کسی معروضی سچائی یا انصاف پر یقین نہیں رکھتا۔

جیک لندن کا ناول "آئرن ہیل" بھی اس حوالے سے اہم ہے۔ جیسے کہ اس کا ایک کردار کہتا ہے کہ اولیگارچ قانون ساز ہوتے ہیں۔ وہ اپنے لیے قوانین بناتے ہیں۔ ناول کے کرداروں میں سے ایک کے ذریعہ بولا جانے والا یہ جملہ سرمایہ داری اور سیاسی عدمیت کی عکاسی کرتا ہے۔ ناول میں کہا گیا ہے کہ سیاسی ادارے جو اشرافیہ کے ایک چھوٹے سے گروہ کے زیر کنٹرول ہیں وہ فطری طور پر غیر منصفانہ اور جابرانہ ہیں۔

فریڈرک نطشے ااپنی کی کتاب "Thus Spok Zarathustra" میں کہتاہے کہ میں آپ کو اوور مین سکھاتا ہوں۔ انسان ایک ایسی چیز ہے جس پر قابو پالیا جائے گا۔ آپ نے اس پر قابو پانے کے لیے کیا کیا ہے؟ اب تک تمام مخلوقات نے اپنے آپ سے آگے کچھ پیدا کیا ہے؛ اور کیا آپ اس عظیم سیلاب کے کنارے بن کر واپس جانا چاہتے ہیں؟ انسان پر قابو پانے کے بجائے درندے؟ انسان کے لیے بندر کیا ہے؟ ہنسنے کا سامان یا تکلیف دہ شرمندگی۔ اور انسان صرف وہی ہو گا جو غالب کے لیے ہو، ہنسنے والا یا دردناک شرمندگی۔ یہ حوالہ نطشے کے اس عقیدے کی عکاسی کرتا ہے کہ عظمت حاصل کرنے کے لیے انسانوں کو خود پر قابو پانا چاہیے اور یہ کہ انسانی وجود کا حتمی مقصد روایتی اخلاقی اور اخلاقی اقدار سے بالاتر ہو کر "اوور مین" کا ایک آئیڈیل تخلیق کرنا ہے۔

اردو ادب میں سیاسی عدمیت:

اردو ادب میں ہمیشہ سے سیاسی، سماجی اور معاشی موضوعات کو موضوعِ تحریر بنایا گیا ہے۔ نو آبادیات کے زمانے میں لکھی جانے والی تحریریں ہوں یا تقسیم کے دوران انسان سوز واقعات کو بیان کرنا ہو یا پھر تقسیمِ ہند کے بعد پیش آنے والے مسائل تمام موضوعات کے متعلق اردو ادب کے لکھاریوں نے قلم اٹھایا۔ اگر ان تحریروں کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان تحریروں میں سیاسی عدمیت کے نظریات موجود ہیں۔ اردو ادب میں سب سے زیادہ جس مصنف کی تحریروں میں سیاسی عدمیت کے نظریات موجود ہیں وہ منٹو ہے۔ سعادت حسن منٹو اردو کے ایک نامور ادیب ہیں جن کی تحریروں میں سیاسی عدمیت کے نظریات موجود ہیں۔ منٹو کی کہانیاں اکثر ہندوستان اور پاکستان کی تقسیم، تشدد اور افراتفری کی عکاسی کرتی ہیں، اور ان میں اکثر ایسے کردار دکھائے جاتے ہیں جنہوں نے اپنی زندگیوں پر حکمرانی کرنے والے سیاسی نظام پر اعتماد کھو دیا ہے۔ منٹو کی تحریر میں مایوسی اور مایوسی کا احساس ہے، اور ان کے کردار اکثر ایک ایسی دنیا میں پھنسے ہوئے ہوتے ہیں جو ان کے مصائب سے لاتعلق ہے۔ منٹو کی سب سے مشہور کہانیوں میں سے ایک "ٹوبہ ٹیک سنگھ" سیاسی عدمیت اور تقسیم کی مضحکہ خیزی کی ایک طاقتور تحقیق ہے۔ اس کہانی میں ایک ذہنی پناہ کے قیدی ہندوستان اور پاکستان کے درمیان پکڑے گئے ہیں اور وہ اپنے ارد گرد ہونے والے تشدد کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ کہانی کا اختتام ٹوبہ ٹیک سنگھ نامی شخص کی ایک پُرجوش تقریر کے ساتھ ہوتا ہے جو ہندوستان اور پاکستان

میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنے سے انکار کرتا ہے اور اس کے بجائے بیچ میں کھڑا ہونے کا انتخاب کرتا ہے جو کہ تقسیم کی بے معنویت کی علامت ہے۔ منٹو کی کہانیوں میں اکثر اپنے وقت کی سماجی وسیاسی حقیقتوں کی عکاسی ہوتی ہے بشمول ہندوستان کی تقسیم اور اس کے بعد ہونے والے تشدد کے۔ ان کی تحریروں میں اکثر سیاسی ہلچل کے دوران انسانی حالت کی تاریکی اور ناامیدی کی تصویر کشی کی گئی تھی۔

سعادت حسن منٹو "ٹوبہ ٹیک سنگھ" میں لکھتے ہیں :

"ٹوبہ ٹیک سنگھ نے محسوس کیا کہ دنیا الٹ گئی ہے۔ ماضی میں وہ برطانوی سلطنت کا وفادار رہا ہے لیکن اب ان سے کہا جا رہا ہے کہ وہ ہندوستان اور پاکستان میں سے کسی ایک کا انتخاب کریں۔ وہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کا آدمی تھا اور بس اتنا ہی اہم تھا اس نے ہندوستان اور پاکستان میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنے سے انکار کر دیا اور تقسیم کی لغویت کی علامت کے طور پر بیچ میں کھڑے ہونے کا انتخاب کیا۔ اس نے امن اور آزادی کا احساس محسوس کیا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کی زندگی پر حکمرانی کرنے والے سیاسی نظام بے معنی ہیں اور صرف ایک چیز جو اہمیت رکھتی ہے وہ اس کا اپنا احساس تھا۔"(۱)

اسی طرح افسانے میں منٹو ایک اور جگہ لکھتا ہے:

"پاکستان کہاں ہے؟" اس نے دوبارہ پوچھا۔

"یہاں۔" انہوں نے زمین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ٹوبہ ٹیک سنگھ کو سمجھ نہیں آیا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ "زمین" سے ان کا کیا مطلب ہے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ "پاکستان" سے ان کا کیا مطلب ہے۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ اور اہلکاروں کے درمیان تبادلے کا سلسلہ جاری ہے"۔(۲)

اس اقتباس کو پڑھتے ہی قاری سیاسی عدمیت کے احساس سے دوچار ہو جاتا ہے کیونکہ کردار تقسیم کی حقیقت اور اس سے پیدا ہونے والے افراتفری کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اس اقتباس سے سیاسی عدمیت کے نظریات سامنے آتے ہیں۔ مصنف اس سیاسی نظام کو رد کرتا ہے اس کے نزدیک یہ نظام بے معنی ہے اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے اسے ختم ہو جانا چاہیے۔

اس کے علاوہ عصمت چغتائی کی تحریروں میں سیاسی عدمیت کے نظریات موجود ہیں۔ چغتائی کی تحریر اکثر ہندوستانی معاشرے کی پدرانہ اور قدامت پسند اقدار پر تنقید کرتی ہے اور وہ اکثر ایسے کرداروں کی عکاسی کرتی ہیں جو طاقت کے ان نظاموں میں پس رہے ہیں۔ چغتائی کی کہانیوں میں بغاوت اور انحراف کے احساس کی خصوصیات ہیں اور وہ اکثر اپنے کرداروں کو روایت اور جدیدیت کے درمیان پھنستے ہوئے پیش کرتی ہیں۔ چغتائی کی سب سے مشہور کہانیوں میں سے ایک "لحاف" اس حوالے سے اہم ہے۔ چغتائی کی کہانیاں اکثر جنس اور جنسیت کے مسائل سے نمٹتی ہیں لیکن انھوں نے اپنے وقت کے سیاسی منظرنامے کو بھی تلاش کیا۔ ان کی تحریروں میں اکثر سیاسی جبر کا سامنا کرتے ہوئے پسماندہ برادریوں کے افراد کی جدوجہد کی عکاسی ہوتی ہے۔ اس کہانی میں ایک نوجوان لڑکی کو ایک آنٹی کے ساتھ رہنے کے لیے بھیجا گیا ہے جس کے بارے میں افواہ ہے کہ اس میں ہم جنس پرست رجحانات ہیں۔ کہانی جبر اور خواہش کے موضوعات کے متعلق ہے۔ مثلاً عصمت چغتائی "لحاف" میں لکھتی ہیں:

> "ملک کی تقسیم ہو چکی تھی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں نے زمین کے ذریعے ایک لکیر کھینچ کر اسے تقسیم کر دیا تھا۔ لیکن اماں بی کے لحاف سے لکیر نہیں کھینچی گئی تھی۔ لحاف پوری طرح برقرار رہا، جیسا کہ ملک کبھی تھا۔"(۳)

اس اقتباس سے پتا چلتا ہے کہ وہ سیاسی نظام کی نفی کرتی ہیں کیونکہ ملک مذہبی اور سیاسی تقسیم سے ٹوٹ گیا تھا۔ ایک اور جگہ لکھتی ہیں:

> "دنیا ایک تاریک اور خطرناک جگہ تھی۔ وہاں کوئی حفاظت، کوئی سلامتی، کوئی امن نہیں تھا۔ صرف ایک چیز جو اہم تھی وہ بقا تھی اور جو بچ گئے وہ زندہ رہنے کے لیے کچھ بھی کریں گے۔"(۴)

یہ اقتباس تقسیم ہند کے بعد سیاسی عدمیت کے احساس کی عکاسی کرتا ہے کیونکہ کرداروں کو اس افراتفری اور تباہی کا سامنا کرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا ہے جو ان کے معاشرے پر ڈھائی گئی ہے۔

انتظار حسین کی تحریروں میں تقسیم کے بعد پاکستان میں رونما ہونے والی سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کی عکاسی کی جاتی ہے۔ ان کی کہانیوں میں نقل مکانی، شناخت، اور ثقافتی ورثے کے نقصان کے موضوعات کو موضوعِ تحریر بنایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ فیض احمد فیض ایک معروف شاعر اور سیاسی کارکن تھے جنھوں نے

محنت کش طبقے کی جدوجہد اور جبر کے خلاف جدوجہد کے بارے میں لکھا۔ ان کی تحریروں میں اکثر اپنے وقت کی سیاسی عدمیت اور سماجی تبدیلی کی ضرورت کی عکاسی ملتی ہیں۔

انتظار حسین کے ناول بستی میں سیاسی عدمیت کے نظریات موجود ہیں۔ مثلاً ناول "بستی" میں لکھتے ہیں:

> "سڑک خالی تھی، کرفیو کا وقت تھا، شہر کی خاموشی صرف فوجیوں کے جوتوں کی آواز سے ٹوٹتی تھی، دور سے چند کتے بھونک رہے تھے، شہر قبرستان جیسا تھا۔ اگر دنیا ختم ہو جاتی۔"(۵)

یہ اقتباس جو پاکستان میں مارشل لاء کے حالات کو بیان کرتا ہے سیاسی عدمیت کا احساس دلاتا ہے کیونکہ کرداروں کو اس افراتفری اور تباہی سے دوچار کرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا ہے جو ان کے معاشرے پر ڈھائی گئی ہے۔

منشی پریم چند کی تحریروں میں سیاسی عدمیت کے نظریات دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے ناول "گئودان" میں سیاسی عدمیت کے نظریات موجود ہیں۔ جیسے ناول "گئودان" میں لکھتے ہیں:

> "غربت ایک ایسی لعنت تھی جو نسل در نسل منتقل ہوتی رہی۔ ایسا لگتا تھا جیسے گاؤں کو اپنی لپیٹ میں لینے والے مایوسی اور ناامیدی کے چکر کو کوئی چیز نہیں توڑ سکتی۔"(۶)

یہ حوالہ سیاسی عدمیت کے احساس کی عکاسی کرتا ہے جو ہندوستان کی برطانوی نوآبادیاتی حکمرانی کے ساتھ تھا کیونکہ کرداروں کو غربت اور جبر کا سامنا کرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا ہے جو ان کے معاشرے پر ڈھائے گئے ہیں۔

انیس ناگی کے ناولوں میں سیاسی عدمیت:

انیس ناگی کا دور مارشل لاء کا دور تھا۔ اس دور کے لوگوں کے لیے یہ کسی بھیانک خواب سے کم نہ تھا۔ یہی وہ دور تھا جس میں اظہارِ رائے کی آزادی پر سب سے پہلے قدغن لگی۔ جہاں اس گھٹن زدہ ماحول نے لوگوں میں خوف طاری کیا وہی عدمیت اور لایعنیت جیسے نظریات نے جنم لیا۔ یہ دور ذہنی کشمکش کا دور تھا پاکستانی عوام اضطراب کی کیفیت میں مبتلا تھا۔ انہی مسائل نے زندگی کی بے معنویت کو جنم دیا۔ ادیب ایک حساس شخصیت

کا مالک ہوتا ہے لہٰذا اس دور کے ادیبوں نے بھی ان مسائل کو محسوس کیا اور انہیں موضوعِ تحریر بنایا۔ انیس ناگی کا تعلق بھی اس دور سے تھا اور انہیں اس دور کی ایک مؤثر آواز سمجھا جاتا تھا۔ چونکہ انیس ناگی ایک بیرو کریٹ تھے لہٰذا انہوں نے اس تمام صورتِ حال کو قریب سے دیکھا اور اسے اپنا موضوعِ تحریر بنایا۔ انیس ناگی کے ناول دیوار کے پیچھے، میں اور وہ، اور زوال میں ان تمام مسائل کی منظر نگاری کی گئی ہے۔

انیس ناگی کے ناول دیوار کے پیچھے میں سب سے زیادہ سیاسی عدمیت پائی جاتی ہے۔ اس ناول میں دکھایا گیا کہ ناول کا مرکزی کردار سیاسی نظام سے اکتا گیا ہے اور وہ اس پورے نظام کو رد کرنا چاہتا ہے۔ کہانی کے ہر موڑ پر وہ اس نظام سے انکار کرتا ہے۔ ناول کے آغاز میں ناول کے مرکزی کردار پروفیسر کو ملازمت سے فارغ کر دیا جاتا ہے جس کی وجہ پروفیسر کے سیاسی نظریات تھے۔ انہی نظریت کی بنا پر ایجنسیوں کے لوگوں کے ذریعے اس کی نگرانی کی جاتی تھی۔ ایک جگہ پروفیسر کہتا ہے کہ

> "یقیناً کوئی میرے تعاقب میں ہے، یہ میرا وہم یا دماغی اختراع نہیں ہو سکتی، کیونکہ نہ جانے کیوں اب ہر وہم کچھ دیر کے بعد ظاہر ہونے والی حقیقت کا پیش خیمہ بن چکا ہے، میں کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر کے خطرے کے وجود سے انکار نہیں کر سکتا۔ وہی شخص میرے تعاقب میں ہے جو رستوران کی ایک نکڑ میں اونگھنے کا بہانہ کیے ہوئے کنکھیوں سے میری حرکات کا جائزہ لے رہا تھا، میں پہلے اسے امرد پرست سمجھا کہ وہ مسکراتی ہوئی آنکھوں کے اشاروں سے مجھے سمجھانے کی کوشش کر رہا ہے۔"(۷)

ناول کا مرکزی کردار سیاسی عدمیت کا حامی ہے وہ اپنے ملک کے سیاسی نظام کو رد کرنا چاہتا ہے۔ یہی ریاستی عناصر پروفیسر کو نوکری سے نکال دیتے ہیں اور اس کا تعاقب بھی کرتے ہیں۔ انیس ناگی نے جب یہ ناول تحریر کیا تو مارشل لاء کا دور تھا۔ اسی لیے اس ناول میں اس دور کے حالات کا ذکر جگہ جگہ موجود ہے۔ ناول میں بھی دکھایا گیا ہے کہ مارشل لاء کے دور میں نظامِ ریاست کے خلاف بغاوت نے سیاسی عدمیت کو جنم دیا اور اس نظام کو بے معنی سمجھا گیا۔ ایک اور جگہ پروفیسر لکھتا ہے کہ

> "میں نے صرف یہ بے احتیاطی کی کہ اپنے شاگردوں سے کھلے بندوں ملتا، ہر قسم کے موضوعات پر بیباک گفتگو کرتا تھا اور تنہائی میں اس نظام کی تبدیلی کے بارے میں سوچتا رہتا، میں نے نادانستہ طور پر وہ طریقِ زندگی اختیار کیا جو نہ جانے کیوں نہیں مستحسن

سمجھا جاتا ہے۔ مجھے جن شرائط پر ملازم رکھا گیا تھا ان میں یہ درج نہیں تھا کہ میں تنہائی میں غیر ممنوعہ موضوعات پر غور وفکر نہیں کروں گا، غلطی مجھ سے ہوئی، مجھے زندگی گزارنے کا فن نہیں آتا تھا مجھے ڈیل کارنیگی کی کتاب پڑھنی چاہیے تھی، اگر میں نے اس کا مطالعہ کیا ہوتا تو پروفیسر جمیل کی وارننگ سے دور رس معانی اخذ کرتا اور اس ریستوران میں جانے سے گریز کرتا جہاں شام کو مشتبہ افراد آتے ہیں، آج بھی میں نے کتنی حماقت سے کام کیا تھا کہ اتنا بڑا حادثہ گزرنے کے باوجود بھی وہاں گیا اور اب اپنے تعاقب کا خمیازہ بھگت رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے اس کے پاس میری گرفتاری کے وارنٹس ہوں شائد اس لیے مجھ تک پہنچنا چاہتا ہے، میں بہت بزدل ہوں۔ (۸)

سیاسی عدمیت جیسے نظریات کا حامل ہونے کی وجہ سے سارے معاشرے میں پروفیسر کو مشکوک سمجھا جاتا ہے۔ سارے ناول میں ہمیں ایک بندہ پروفیسر کا تعاقب کرتا دکھائی دیتا ہے۔ جگہ جگہ ناول میں سیاسی نظام سے انکار اور بغاوت کا ذکر موجود ہے اور ریاست کے نمائندے اس کے اس رویے کو روکنے کے لیے ہر قسم کی کوشش کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ انہی نظریات کی بدولت پروفیسر کا معاشی استحصال کیا جاتا ہے۔ ایک جگہ پروفیسر لکھتا ہے کہ

"مشکوک آدمی اتنی جلدی خلاصی نہیں پا سکتا، مشکوک ہمیشہ مشکوک ہی رہتا ہے، یہ ایسا داغ ہے جسے سات سمندروں کا پانی بھی نہیں دھو سکتا۔ نگرانی تو محض بہانہ معلوم ہوتی ہے وہ دراصل میرے منصوبے جاننا اور پوچھنا چاہتا ہے کہ میں سب کچھ جانتے ہوئے بھی کیوں خطرناک راستے پر چل رہا ہوں؟" (۹)

ایک اور جگہ پروفیسر کہتا ہے کہ

" بہروپیے تم کبھی ریستوران کا بیرا بن بن کر بڑے ادب سے مجھ سے سیاسی حالات پوچھتے ہو اور کبھی شاگرد بن کر انقلاب چین کے بارے میں طرح طرح کے سوالات اٹھاتے ہو، جو تم مجھ سے پوچھتے ہو وہ میں تمہیں ہرگز نہیں بتاؤں گا۔" (۱۰)

اسی طرح ایک اور جگہ مرکزی کردار کہتا کہ

"میں کس کے پاس جا کر فریاد کروں کہ میرے ساتھ زیادتی کی گئی۔" (۱۱)

پروفیسر کہتا ہے کہ

"یہ کسی ایک فردِ واحد کی کہانی نہیں ہو سکتی بلکہ ایک ایسے نظام کی واردات ہے جو یہاں کسی کو نہیں جینے دے گا۔ جو اپنی بقا کے لیے ہر ایک کو کچلنے پر آمادہ نظر آتا ہے۔۔۔ نہیں نہیں میں ایسے نظام کا حصہ نہیں ہو سکتا۔"(۱۲)

ایک اور جگہ ناول کا مرکزی کردار کہتا ہے:

"میں اس صورتِ حال کو زیادہ دیر برداشت نہیں کر سکتا، میرا استحصال کیا گیا ہے۔ میں اس نظام سے بغاوت کروں گا، یہ نظام بے معنی ہے۔۔۔"(۱۳)

ناول میں ریاستی عناصر کو افراد کا استحصال کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ ریاستی ادارے ہر فرد پر نظر رکھتے ہیں اور فردی آزادی کو غصب کرتے ہیں۔ سارا نظام پروفیسر کا کچلنا چاہتا ہے۔ وہ نظام سے خائف ہے وہ اس نظام کے خلاف ہے۔ جیسا کہ ایک جگہ پروفیسر کہتا ہے کہ

"میں ان سے اس طرح چھپتا بھاگتا پھروں گا جیسے میں نے کوئی اخلاقی جرم کیا ہے، میں نے کوئی تخریبی کاروائی نہیں کی، کسی سازش میں شرکت نہیں کی پھر مجھے کیوں ہدف بنایا گیا ہے؟ زندگی کے کسی شعبے میں میرا کوئی حریف نہیں ہے، یہ کسی ایک فرد واحد کی انتقامی کاروائی نہیں ہو سکتی بلکہ ایک ایسے نظام زندگی کی واردات ہے جو اپنی بقا کے لیے ہر ایک کو کچلنے پر آمادہ نظر آتا ہے"۔(۱۴)

ناول میں دکھایا گیا ہے کہ ایجنیوں کے لوگ شہریوں کا استحصال کرتے ہیں۔ انہیں ذہنی اور جسمانی تشدد کا نشانہ بناتے ہیں اور شہریوں کے حقوق کو غصب کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ پروفیسر اس نظام رد کرتے ہوئی دکھائی دیتا ہے اور اسی وجہ سے پروفیسر کا معاشی اور ذہنی استحصال کیا جاتا ہے۔ اس بات کا اظہار ناول میں بار بار دکھائی دیتا ہے۔ ناول میں پروفیسر کہتا ہے کہ

"بعض لوگ انسان ہوتے ہوئے بھی بھوتوں کے خصائص رکھتے ہیں مگر انھیں اس کا احساس نہیں ہوتا"۔(۱۵)

اسی طرح ایک اور جگہ پروفیسر ان خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہوئے کہتا ہے کہ

"ہر معاشرہ، ہر نظام ہر فرد کو ایندھن کے طور پر استعال کرتا ہے، اس حد تک اسے برتتا ہے کہ فرد صابن کی گھسی ہوئی ٹکیہ بن جاتا ہے، وہ ختم ہو جاتا ہے، خس و خاشاک بن کر اڑ جاتا ہے اور یہ عنقریب ہنستا ہوا دوسرے کی طرف اپنے پنجے بڑھاتا ہے۔"(۱۶)

ایک اور جگہ پروفیسر اس کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے کہ

"ایک ہی شخص میرا تعاقب کرتا ہے البتہ وہ اپنا حلیہ بدلتا رہتا ہے۔ ان قرائن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ میری نگرانی کی جانی ضروری ہے۔ میرے علاوہ اور بہت سے لوگوں کی نگرانی بھی کی جاتی ہوگی۔ میرا خیال ہے کہ تمام اہم افراد کی بھی نگرانی کی جاتی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ گھر سے باہر کوئی کھلے بندوں نہیں پھر سکتا۔ اس کی اور میری جیب میں، ایک ہی مقام اور ایک ہی وقت پر پہنچنے کے دعوت نامے ہوتے ہیں، میں یقیناً کسی سازش کا شکار ہوں، اس صورت میں زندہ رہنا محال ہے۔"(۱۷)

اسی طرح جب مشکوک افراد پروفیسر کا پیچھا کر رہے ہوتے ہیں تو وہ کہتا ہے کہ

"اوہ ہو، آخر تم نے اپنے میرا گھر تلاش کر لیا ہے، اتنی تگ و دو کرنے کی کیا ضرورت تھی ؟ میرے ساتھ چلے آتے، جس نے تمہیں میرے پیچھے بھیجا ہے، اسے کہ دو مجھے یہ طور طریقے پسند نہیں ہیں۔ مجھے ہر طرح کے جبر سے نفرت ہے، تم نے کیسے ذہن کے اندر جھانک کر یہ دیکھ لیا کہ میں استحصال کو پسند نہیں کرتا۔ تم کتنے بے شرم ہو کہ تم نے میری برہنہ سوچ دیکھ لی ہے، جاؤ میرا پیچھا چھوڑو اور مجھے چین کی نیند سونے دو۔"(۱۸)

تمام سیاسی اور ریاستی نظام کی بدولت پروفیسر سیاسی عدمیت کے نظریات کو ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے اور اس نظام کو رد کرنا چاہتا ہے۔ نوکری کے جانے کے بعد پروفیسر اپنی سوچوں میں گم سڑک پر چل رہا ہوتا ہے تو کہتا ہے کہ

"یہ کیسے ممکن ہے ؟ زندگی نے یونہی گزرنا ہے، اختیار کی صلاحیت اس معاشرے میں ہوتی ہے جہاں قول و فعل کی آزادی ہو، جہاں زندگی کا کل مقصد نہایت ہی اوچھے اور بہیمانہ طریقے سے حصول رزق کی رسم ہو، وہاں ہر معاملے میں دب کے ہی زندگی بسر کی جاسکتی ہے۔"(۱۹)

ناول کا مرکزی کردار جب معاش کی تلاش میں سڑک پر جا رہا ہوتا ہے تو خود کلامی کرتے ہوئے کہتا ہے کہ

"وہ مجھے پکڑنا چاہتے ہیں، گلی میں چند سائے بڑی تیزی سے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے ہیں، میں دریچے کی اوٹ میں سے دیکھ رہا ہوں۔۔۔۔۔۔۔ اوہ، میں تھک گیا ہوں، ذہن کو فارغ دیکھ کر خدشوں نے گھیر لیا ہے۔"(۲۰)

ملازمت سے نکالنے کے بعد بھی ریاستی عناصر پروفیسر کا استحصال کرنا نہیں چھوڑتے اور پروفیسر کو ذہنی اذیتیں پہنچاتے ہیں جس کی وجہ سیاسی عدمیت کے نظریات ہیں۔ پروفیسر ذہنی اضطراب کا شکار دکھائی دیتا ہے جیسے وہ کہتا ہے کہ

"غالباً یہ موت کا اندھیرا ہے؟ نہیں میں جوانی کی موت کا اہل نہیں ہوں، میں نے طوالت عمر کے ذریعے ہر انسانی مصیبت کا منہ دیکھنا ہے، دیکھنے اور خاموشی میں بولنے والے، سرگوشی میں گفتگو کرو، یہاں اونچا بولنے اور سوچنے کی اجازت ہے، یہاں کسی قسم کی امر ناع نہیں ہے۔ خنزیر کے بچے، تمھارا اور میرا تعلق کب کا ختم ہو چکا ہے، تمھارا مشن کب کا مکمل ہو چکا ہے۔ اب مجھ سے کون سا راز اگلوانا چاہتے ہو؟ مجھے پوری طرح احساس ہے کہ فی زمانہ ہر طرح کے راز رکھنے کی ممانعت ہے، تاہم میرے پاس اپنی سوچ کے علاوہ اور کوئی راز نہیں ہے، اس راز کی نوعیت سمجھے بغیر میرے لیے بے روز گاری کی سزا سراسر غیر انسانی فعل ہے۔ کیا مجھے سزا دی جانی ضروری تھی؟ کیا سزا کے لیے جرم کا ارتکاب ضروری نہیں؟ مجھے گرفتار مت کیا جائے، مجھے برف کی سلی پر مت لٹایا جائے میں پہلے ہی خنجر کی دھار پر ہوں، میں نے کسی حد تک اپنی مرضی کے مطابق زندہ رہنے کی کوشش کی ہے، یہ واقعی ایک جرم ہے، میں وعدہ کرتا ہوں کہ دوبارہ اس کا ارتکاب نہیں کروں گا، میں پھر کبھی احتجاج نہیں کروں گا، سورج کی طرح جلتے ہوئے یہ بلب بجھا دو۔۔۔"(۲۱)

ناول میں سیاسی عدمیت کے نظریات جگہ جگہ دکھائی دیتے ہیں۔ ناول میں دکھایا گیا ہے کہ جو لوگ انقلاب کی بات کرتے ہیں دراصل وہ ایجنسیوں کے ساتھ ملے ہوئے ہیں اور سیاسی نظام کے باغیوں کی جاسوسی کرتے ہیں۔ مثلاً پروفیسر جب کیفے میں چائے کے لیے جاتا ہے تو وہاں موجود افراد یہ کہتے ہیں کہ

"بعض جز وقتی انقلابی انقلاب کے انتظار میں حکیم صاحب کی نیت پر شک کرنے لگے ہیں کہ وہ کسی خاص مقصد کے تحت یہاں آتے ہیں"۔(۲۲)

ملازمت کے جانے کی وجہ پوچھنے پر پروفیسر کہتا ہے کہ

"اگر یہ پوچھا جائے کہ تم نے سابقہ ملازمت کیوں کر چھوڑی؟ اس لیے کہ میرے سیاسی نظریات کو غلط طور پر خطرناک سمجھا گیا ہے، واہ رے میرے یار اتنے صاف گو ہونے کی ضرورت بھی نہیں اس طرح نوکری نہیں ملتی۔"(۲۳)

اسی طرح ایک اور جگہ پروفیسر موجودہ سیاسی نظام کو رد کرتا ہے اور نئے نظام کی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ

"مہینوں سے جلوس اور جلسوں کا سلسلہ چل رہا ہے، یہ ایک شہر تک محدود نہیں سارے شہر اس کی لپیٹ میں ہیں۔ تبدیلی کی خواہش خارش کی طرح سارے بدن پر ابھر آئی ہے، یہ تاریخ کا وہ عمل ہے جو دس سال سے بظاہر رکا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ ہر ایک یہی سمجھتا تھا کہ تاریخی حرکت، سب نظریات باطل ہیں، وقت سو گیا ہے، ہر ایک کے لیے زندگی اتنی کٹھن بنا دی گئی ہے۔"(۲۴)

اختتامی صفحات میں پروفیسر ایجنسیوں کے لوگوں میں شامل ہو کر جب گشت کے لیے جاتا ہے تو ناول میں انیس ناگی لکھتے ہیں کہ

"لفٹ رایٹ۔۔۔۔استحصال کے خلاف لانگ مارچ۔۔۔۔۔۔کائناتی قوتوں کے خلاف لانگ مارچ بڑا سخت مقابلہ ہے۔۔۔۔۔"۔(۲۵)

دیوار کے پیچھے میں سیاسی عدمیت کے نظریات بہت واضح دکھائی دیتے ہیں۔ ناول کے مختلف کردار اس سیاسی نظام کو رد کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

انیس ناگی کے ناول میں اور وہ میں سیاسی عدمیت کے نظریات دکھائی دیتے ہیں۔ اس ناول کا مرکزی کردار سیاسی نظریات اور اداروں کو رد کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً ناول کے آغاز ہی میں وہ تمام سیاسی نظریات کو رد کرتے ہوئے کہتا ہے:

"سیاست نئے شعور کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ میرے کوئی نظریات نہیں ہیں کہ میری موجودہ صورتِ حال بذاتِ خود ایک سیاست بن چکی ہے۔ میں کسی کا آلہ کار نہیں ہوں، میں نے کسی راجدھانی کا خواب نہیں دیکھا۔"(۲۶)

ناول میں جگہ جگہ یہی نظریات دکھائی دیتے ہیں۔ انیس ناگی نے اس ناول میں بیانیے کی تکنیک استعمال کی ہے۔ مرکزی کردار میں کا صیغہ ہے۔ جو اپنے معاشرے کے سیاسی نظام کی مخالفت کرتے دکھائی دیتا ہے۔ ایک اور جگہ نیس ناگی لکھتے ہیں:

"میرے ساتھ ناانصافی کی گئی ہے۔ مقدمہ چل رہا ہے۔ اس فیصلے کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ نظام فیصلوں کے لیے نہیں ہے، ہر ایک بات کو معلق کرنے کا بندوبست کیا جاتا ہے کہ کوئی شخص بھی کسی انجام تک نہ پہنچے۔ یہاں حق دینے یا دلوانے کی رسم نہیں ہے لیکن میں حق چھین نہیں سکتا"۔[۲۷]

اسی طرح آگے جا کر ژاکو نامی کردار جو کہ ایک غیر ملکی ہے کہتا ہے:

"کیا بتاؤں خیر تم دوست ہو، مجھے اپنے ملک سے محبت ہے، لیکن یہ ضروری نہیں کہ مجھے اس نظام سے بھی محبت ہو"۔[۲۸]

انیس ناگی کے ناول زوال میں بھی سیاسی عدمیت کے نظریات دکھائی دیتے ہیں۔ اس ناول کا مرکزی کردار احسن ایک سرکاری ملازم ہے جو اپنے سیاسی نظام سے تنگ ہے۔ اور وہ ان سے فرار چاہتا ہے۔ یہی وہ نظام ہے جو سب کا ذہنی استحصال کر رہا ہے اور انسان بے بس ہے۔ مثلاً مرکزی کردار کہتا ہے:

"یہاں جتنی سیڑھی اونچی ہو گی اتنا شک زیادہ ہو گا یہ سارا نظام شک اور عدم اعتماد پر چلتا ہے کون سا اصول؟۔۔۔۔۔۔۔"[۲۹]

احسن کے بولے گئے یہ الفاظ سیاسی عدمیت کی عکاسی کرتے ہیں۔ اس کے نزدیک اس نظام کے کوئی اصول نہیں ہیں۔ یہ سارا نظام شک اور عدم اعتماد پر چلتا ہے۔ کسی کو کسی پر کوئی اعتماد نہیں سب بے معنی اور بے مقصد ہے جس کی کوئی ٹھوس بنیاد نہیں۔ ایک اور جگہ احسن کہتا ہے کہ

"سارے سازشی ہیں، یہ ان کی صوبائی نفرت ہے، یہ سارا نظام قابلِ قبول نہیں۔"[۳۰]

اس جملے میں سیاسی نظام پر تنقید کر کے اسے رد کیا گیا ہے۔ احسن سیاسی نظام کو سازشی عناصر سمجھتا ہے جو اس کا استحصال کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ان سے بغاوت کرنا چاہتا ہے لیکن یہ نظام اسے بے بس بنا دیتا ہے اور وہ آخر میں اس سے فرار چاہتا ہے۔

انیس ناگی کے منتخب کردہ ناول دیوار کے پیچھے، میں اور وہ اور زوال تینوں میں سیاسی عدمیت کے نظریات موجود ہیں تینوں ناولوں کے کردار سیاسی نظام کی مخالفت کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ نظام بے وقت ہے، نہ اس کی کوئی حیثیت ہے اور نہ ہی یہ کسی ٹھوس بنیاد پر قائم ہے اور یہ اس قابل نہیں کے اس کی پیروی کی جائے اسی لیے یہ بے معنی ہے۔

ب۔ اخلاقی عدمیت:

تعریف:

اخلاقی عدمیت سے مراد ہے کہ تمام اخلاقی اقدار اور اخلاقی روایات بے معنی ہیں۔ اخلاقی عدمیت اس خیال کی کھوج کرتی ہے کہ اخلاقی اقدار اور عقائد بے بنیاد ہیں اور یہ کہ کوئی معروضی اخلاقی سچائی یا اصول نہیں ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کچھ بھی موروثی طور پر صحیح یا غلط، اچھا یا برا نہیں ہے بلکہ اخلاقی فیصلے انفرادی یا ثقافتی نقطہ نظر سے کیے جاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اخلاقی عدمیت اس تصور کو چیلنج کرتی ہے کہ اخلاقی تصورات یا اعمال کا کوئی حتمی مطلب یا مقصد ہے۔

آغاز وارتقا:

فریڈرک نطشے اور ژاں پال سارتر کچھ ایسے مصنفین ہیں جو اخلاقی عدمیت کے حامی ہیں۔ دوسرے مصنفین جو اخلاقی عدمیت کی حمایت کرتے ہیں ان میں میکس اسٹرنر، ایمل سیورن، اور رچرڈ جوائس شامل ہیں۔ فریڈرک نطشے ایک مشہور فلسفی ہے جس نے اخلاقی عدمیت کے بارے میں بڑے پیمانے پر لکھا۔ ان کا خیال تھا کہ روایتی اخلاقیات ایک ایسا آلہ ہے جسے اقتدار میں رہنے والوں نے عوام کو کنٹرول کرنے کے لیے استعمال کیا۔ نطشے نے دلیل دی کہ کوئی معروضی اخلاقیات نہیں ہیں اور یہ کہ افراد کو اپنی اقدار خود تخلیق کرنی چاہییں۔ ژاں پال سارتر ایک فرانسیسی فلسفی تھا جس نے اخلاقی عدمیت کے متعلق نظریات پیش کیے۔ اس کا خیال تھا کہ افراد زندگی میں اپنا مطلب پیدا کرنے کے لیے آزاد ہیں لیکن یہ آزادی انتخاب کرنے اور اس انتخاب کے نتائج کو قبول کرنے کی ذمہ داری کے ساتھ بھی آتی ہے۔ میکس اسٹرنر ایک جرمن فلسفی تھا جس کا ماننا تھا کہ افراد کو اخلاقی یا سماجی اصولوں کی پابندی کے بغیر اپنے ذاتی مفادات کے حصول کے لیے آزاد ہونا

چاہیے۔ اس نے دلیل دی کہ اخلاقیات غلامی کی ایک شکل ہے جو افراد کو حقیقی آزادی حاصل کرنے سے روکتی ہے۔ ایمل سیورن ایک رومن فلسفی تھا جس نے اپنی تحریروں میں اخلاقی عدمیت کے تصور کو پیش کیا۔ اس کا ماننا تھا کہ زندگی کا کوئی موروثی معنی یا مقصد نہیں ہے اور یہ کہ زندگی میں معنی تلاش کرنے کے لیے افراد کو اپنی اقدار خود بنانا ہوں گی۔ رچرڈ جوائس ایک اہم فلسفی ہے جس نے اخلاقی عدمیت کے بارے میں بڑے پیمانے پر لکھا ہے۔ وہ دلیل دیتا ہے کہ اخلاقی اقدار معروضی حقائق نہیں ہیں بلکہ سماجی اور ثقافتی کنونشنز کا نتیجہ ہیں۔ جوائس کا خیال ہے کہ افراد اپنی اخلاقی اقدار بنانے کے لیے آزاد ہیں، لیکن یہ اقدار کسی معروضی حقیقت پر مبنی نہیں ہیں۔ ژاں پال سارتر کے "Nausuia" میں اخلاقی عدمیت کے متعلق نظریات پیش کیے گئے ہیں مثلاً سارتر لکھتا ہے کہ میں ان خوش کن اور معقول آوازوں کے درمیان تنہا ہوں۔ یہ تمام مخلوقات اپنا وقت سمجھانے میں صرف کرتی ہیں یہ محسوس کرتے ہوئے کہ وہ ایک دوسرے سے متفق ہیں۔ جنت کے نام پر ایک ہی چیزوں کو ایک ساتھ سوچنا کیوں ضروری ہے۔

مشیل ہوئل بیکق کا "ایک جزیرے کا امکان" بھی اخلاقی عدمیت کی عکاسی کرتا ہے۔ اسی طرح البرٹ کامیو کے ناول دی سٹرینجر اور plague میں بھی اخلاقی عدمیت کے تصورات موجود ہیں۔ مثلاً دی سٹرینجر کا مرکزی کردار کہتا ہے کہ:

> "It was as if that great rush of anger had washed me clean, emptied me of hope, and gazing up at the dark sky spangled with its signs and stars, for the first time, the first, I laid my heart open to the benign indifference of the universe. To feel it so like myself, indeed, so brotherly, made me realize that I'd been happy, and that I was happy still."(۳۱)

فیوڈور دوستوفسکی کا "نوٹس فرام انڈر گراؤنڈ" میں بھی اخلاقی عدمیت کو بڑے عمدہ انداز میں بیان کیا گیا ہے مثلاً دوستوفسکی لکھتا ہے:

> "I say let the world go to hell, but I should always have my tea." (۳۲)

بریٹ ایسٹن ایلس کا "امریکن سائیکو" بھی اخلاقی عدمیت کے اعتبار سے اہم ہے۔

ان ناولوں میں ہمیں اخلاقی عدمیت کے اثرات دکھائی دیتے ہیں ۔ ان کے مرکزی کردار اخلاقی روایات اور معاشی اقدار کو روندتے ہوئے آگے نکلنا چاہتے ہیں۔

اخلاقی عدمیت ایک ایسا تصور ہے جس پر اردو ادب میں خاطر خواہ کام نہیں کیا گیا ہے۔ تاہم کچھ اردو مصنفین ہیں جنہوں نے اخلاقی عدمیت کے نظریات کو اپنی تحریروں میں بیان کیا ہے۔ ایسے ہی ایک ادیب سعادت حسن منٹو ہیں۔ منٹو ایک بہترین مصنف تھا جو معاشرے کی ایماندارانہ تصویر کشی کے لیے جانا جاتا ہے۔ اس کا کام اکثر انسانی فطرت کے تاریک پہلوؤں کی کھوج کرنا تھا اور وہ معاشرتی اصولوں کو چیلنج کرنے سے نہیں ڈرتا تھا۔

منٹو نے اپنی مختصر کہانی "ٹوبہ ٹیک سنگھ" میں زندگی کی بے معنویت اور انسانی حالت کی بے بسی کو بیان کیا ہے۔ کہانی کی بنیاد ایک ذہنی کشمکش پر ہے اور مرکزی کردار بشن سنگھ ایک سکھ ہے جو تقسیم کے دوران ہندوستان اور پاکستان کے درمیان پھنس گیا ہے۔ کہانی کے ذریعے منٹو شناخت کی نوعیت اور زندگی کے معنی پر سوال اٹھاتا ہے۔ ایک اور اردو مصنف جس نے اخلاقی عدمیت کے حوالے سے لکھا ہے وہ عصمت چغتائی ہے۔ چغتائی ایک نسائی مصنفہ تھیں جنہوں نے ہندوستانی معاشرے میں خواتین کی جدوجہد کے بارے میں لکھا۔ اپنی مختصر کہانی "لحاف" میں چغتائی نے جنسیت اور خواہش کے موضوعات کو تلاش کیا ہے۔ کہانی ایک نوجوان لڑکی نے بیان کی ہے جو اپنی خالہ کے پاس رہتی ہے۔ خالہ ایک امیر عورت ہے جس کی شادی ایک بڑے آدمی سے ہوئی ہے۔ لڑکی کو پتہ چلتا ہے کہ اس کی خالہ کے کسی عورت کے ساتھ ناجائز تعلقات ہیں اور یوں کہانی ہندوستانی معاشرے میں ہم جنس پرستی کی ممانعت کی نوعیت کی کھوج کرتی ہے۔ اگرچہ یہ مصنفین واضح طور پر اخلاقی عدمیت کے نظریات پیش نہیں کرتے ہیں لیکن ان کی تحریروں میں اخلاقی عدمیت کے نقش دکھائی دیتے ہیں۔ مثلاً عصمت چغتائی لکھتی ہیں کہ:

> "ربو ایک نوجوان لڑکی تھی جسے اس کی خالہ بیگم جان کے ساتھ شہر کے ایک بڑے گھر میں رہنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ بیگم جان کے ہم جنس پرست رجحانات کی افواہیں پھیلی ہوئی تھیں اور ربو کو جلد ہی پتہ چلا کہ یہ افواہیں سچ ہیں۔ اس نے بیگم کی طرف دیکھا۔

جان کی خادماؤں نے اس کے جسم پر تیل کی مالش کی اور اس نے دیکھا کہ بیگم جان کے ہاتھ ان کے جسموں پر ٹنگے ہوئے ہیں ربو کو اس خواہش اور لذت کی دنیا نے مسحور کیا لیکن اسے خوف اور شرمندگی کا احساس بھی ہوا۔ یہ ایسی چیز نہیں تھی جسے ہندوستانی معاشرے میں قبول کیا گیا تھا اور وہ پریشان تھی کہ اگر کسی کو پتہ چلا تو کیا ہو گا۔رات کو جب وہ بستر پر لیٹی تو بیگم جان کی خوشی کی آوازیں سن کر ربو کو تڑپ اور الجھن کا احساس ہوا۔ وہ اپنی خواہشات کو اپنے معاشرے کی توقعات سے ہم آہنگ کرنا نہیں جانتی تھی۔"(۳۳)

اس اقتباس میں عصمت چغتائی نے اخلاقی روایات کی نفی کی ہے جس کے مطابق ہم جنس پرستی کی ممانعت کی جاتی ہے جسے معاشرہ اخلاقی اصولوں کے خلاف سمجھتا ہے جبکہ ربو اس کی نفی کرنا چاہتی ہے اس کے ذریعے اپنی تسکین چاہتی ہے۔ اسی طرح افسانے میں جگہ جگہ اخلاقی اصولوں کی نفی کی گئی ہے۔ مصنفہ کے نزدیک یہ تمام اقدار و روایات انسان کے وجود کو بے بس بناتی ہیں اور انسان سے اس کا مقصدِ حیات چھین لیتی ہیں۔

انیس ناگی کے ناولوں میں اخلاقی عدمیت:

انیسویں صدی میں جہاں سیاسی عدمیت نے جنم لیا وہی اخلامی عدمیت کی بھی تائید کی جانے لگی۔اس دور کی بے راہ روی نے اخلاقی اقدار کو پیچھے چھوڑ دیا اور انسان نے تمام اخلاقی اقدار اور روایات کو رد کر دیا۔ پاکستان کے سیاسی منظر نامے نے تمام اخلاقی اقدار کو جڑ سے اکھاڑ دیا۔ آئین کی پامالی کی جانے لگی۔ آزاد خیالات کا اظہار کرنے پر پابندی عائد کر دی گئی۔ جو بھی ظلم کے خلاف آواز اٹھاتا اسے پابند سلاسل کر دیا جاتا۔ پکڑ دھکڑ کا سلسلہ جاری تھا۔اس ساری صورتِ حال نے لوگوں پر منفی اثرات مرتب کیے اور انسان نے مذہبی، سیاسی اور اخلاقی نظریات کو بے معنی سمجھنا شروع کیا اور یہی سے اخلاقی عدمیت پروان چڑھنے لگی۔ انیس ناگی نے بھی اخلاقی عدمیت کے اثرات کو قبول کیا اور اسے اپنی تحریروں میں بیان کرنا شروع کیا۔ان کے ناول یوار کے پیچھے، میں اور وہ اور زوال میں اخلاقی نظریات بہت زیادہ دکھائی دیتے ہیں۔

انیس ناگی کے ناول دیوار کے پیچھے میں اخلاقی عدمیت کے نظریات دکھائی دیتے ہیں۔ ناول میں مرکزی کردار پروفیسر ہر موڑ پر اخلاقی اقدار کی نفی کرتا ہے۔ وہ اخلاقی روایات کو بے معنی سمجھتا ہے۔ اس

کے نزدیک یہ سب جھول اور انسان کو قید کرنے کے نظریات ہیں۔ جس سے انسانی وجود کو بے بس بنادیا جاتا ہے اور معاشرہ انسان کو ان تمام نظریات سے نکلنے نہیں دیتا جو نکلنے کی کوشش کرتا ہے اسے مجرم سمجھا جاتا ہے۔ پروفیسر ان تمام اخلاقی پابندیوں کو رد کرنا چاہتا ہے وہ اپنے مطابق زندگی گزارنا چاہتا ہے۔ وہ بہن بھائیوں کی ذمے داریاں، شادی اور مذہب جیسی پابندیوں سے آزاد ہونا چاہتا ہے۔ وہ ان سب کے خلاف ہے وہ ان سب سے رہائی چاہتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ کہتا ہے کہ:

"انسانی رشتوں سے علیحدہ ہو کر انسانی رشتوں کا احساس رکھنا ایک تکلیف دہ عمل ہے، میں اس سے بچنا چاہتا ہوں، اس سے پیدا شدہ شعور کا شعور بڑا تکلیف دہ ہے، ہر چیز مبالغہ آمیز ہو جاتی ہے، ذہن چیخ جاتا ہے، ارد گرد کی دیواریں تنگ ہو کر دماغ کی دیواروں سے مل جاتی ہیں، شریانوں میں خون ابلتا ہے۔"(۳۴)

ایک اور جگہ پروفیسر اپنے باپ کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ

"میرے باپ کی بھی زندگی ایک شخص کی داستان ہے جو متوسط طبقے کی اخلاقیات کا شکار تھا اور وہ چیز حاصل کرنا چاہتا جو عموماً اس طبقے کی دسترس سے باہر سمجھی جاتی ہے۔"(۳۵)

اسی طرح وہ شادی سے بھی انکار کرتا ہے اس کے نزدیک اس کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ مثلاً ناہید سے ایک جگہ کہتا ہے کہ

"دیکھو نزہت بات یہ ہے کہ شادی بذات خود ایک مہمل ارداہ ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ فی زمانہ ایک اقتصادی مسئلہ ہے۔ یہ کھاتے پیتے طبقہ کا مشغلہ ہے، ہر طرف گرانی ہی گرانی ہے اگر تم اس جسمانی ضرورت کے لیے ضروری سمجھتی ہو تو جبلی خواہش اور طریقوں سے بھی پوری کی جا سکتی ہے، میں جنسی خواہش کی تکمیل کو اخلاقیات کا جزو سمجھنے کے بجائے اسے معاشرتی مسئلہ سمجھتا ہوں۔"(۳۶)

ایک اور جگہ پروفیسر اخلاقی نظریات کو رد کرتے ہوئے کہتا ہے کہ

"مجھے اس اخلاقیات کا گلا گھونٹ دینا چاہیے جو ہر راہ میں راستے کا پتھر ہے، میں نے زندہ رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے، اگر یہ فیصلہ واقعی زندگی کے حق میں صادر کیا ہے تو مجھے تمام مسدود راستوں کی ناکہ بندی توڑ کر نیا راستہ بنانا چاہیے، اس وقت مسئلہ میری سالمیت کا ہے کہ اگر میں نہ رہا تو یہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"(۳۷)

ایک اور جگہ پروفیسر کہتا ہے:

"اب احتیاط کی ضرورت ہے، میں یہ راز اپنے آپ کو بھی نہیں بتاؤں گا۔ اب کوئی ضابطہ مجھے حراست میں نہیں لے سکتا، کیونکہ میرے پاس اس تقلیب کا جواز موجود ہے"۔ (۳۸)

اپنی ماں کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر کہتا ہے کہ

"اس نے کبھی میرے کسی معاملے میں دلچسپی کا اظہار نہیں کیا اور نہ ہی مجھے کبھی یہ محسوس ہوا ہے کہ ماں کا رشتہ عام رشتوں سے مختلف ہے، ویسے بھی گھر کے دوسرے افراد کے ساتھ بھی میرے تعلقات رسمی نوعیت کے ہیں۔" (۳۹)

پروفیسر مذہبی نظریات کو بھی رد کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ جیسے اپنی بہن رضیہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ

"رضیہ ایک دم چیخ اٹھی تم میرے قاتل ہو، پیچھے ہٹ جاؤ، تم بے ایمان ہو، بے عقیدہ ہو تمہارے کپڑوں سے پیشاب کی بو آتی ہے۔۔۔۔۔۔۔ اس دن میں نے اپنے آپ سے پوچھا: کیا تم واقعی بے عقیدہ ہو؟ میں کچھ کہہ نہیں سکتا، باپ کی وفات کے بعد میں نے اس مسئلے پر سوچنا چھوڑ دیا ہے کیونکہ میں اب عقیدے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا ہوں" (۴۰)

پروفیسر خوفزدہ ہو کر جب خواب دیکھتا ہے تو کہتا ہے کہ

"روز محشر آپہنچا! اعمال ناموں کے بارے میں استفسارات کیے جانے والے ہیں، ہر طرف شور ہی شور ہے لیکن اس صورت میں اسرافیل نہیں سنائی دی جارہی۔ اگر یہ روز محشر ہے تو باقی لوگ کدھر ہیں؟ صرف میرا کیوں انتخاب کیا گیا ہے؟ میں کس کو جواب دے رہا ہوں۔" (۴۱)

اسی طرح پروفیسر کی ماں بھی بار بار پروفیسر کے مذہبی نظریات سے انکار پر ٹوکتی رہتی ہے۔ ناول کے آغاز میں ہی احمد اخلاقی عدمیت نظریات کی پیروی کرتے ہوئے کہتا ہے کہ

"میں اور پروفیسر اس ممنوعہ باطن کی داستان ہیں، دو ایسے کردار ہیں جو سچ اور جھوٹ کے فاصلوں کی پیمائش نہیں کر سکے"۔ (۴۲)

ناول کے زیادہ تر کردار اخلاقی عدمیت کے نظریات کے حامی نظر آتے ہیں۔ ایک جگہ پروفیسر حمید کے بارے میں کہتا ہے کہ

"اس نے اپنا کمرہ بند کر کے مسلسل بادہ نوشی شروع کر دی تھی، جب اس کے ضعیف مگر لالچی باپ نے اسے منع کیا تو وہ سبزی کاٹنے والی چھری سے اس پر حملہ آور ہوا تھا۔"(۴۳)

پروفیسر کا ہم جماعت حمید اخلاقی نظریات کا حامی ہے وہ پروفیسر کو جواب دیتے ہوئے ان نظریات کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ

"ایک رات بوڑھے باپ نے جسے میں بوڑھا گدھا کہتا ہوں، موت سے خوف زدہ ہو کر یہ رقم میرے نام منتقل کر دی تھی بعد میں اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ اس کی صحت تو کافی اچھی ہے اور یہ سرمایہ شراب کی نظر کر دوں گا، وہ اسے حاصل کرنے کے لیے سینکڑوں جتن کر رہا ہے۔"(۴۴)

اسی طرح ایک اور جگہ کہتا ہے کہ

"تم چاہتے ہو کہ میں دیر سے گھر جاؤں اور اس بوڑھے گدھے سے گوشت نچواؤں، تم میری دکھتی ہوئی رگ پر کیوں ہاتھ رکھتے ہو؟ میں نے اسے کسی قدر غصے سے جواب دیا: اس میں مشتعل ہونے کی کیا بات ہے؟ نہیں پروفیسر وہ مجھے چھوٹا سا بچہ سمجھتا ہے جب تک میں گھر واپس نہ آ جاؤں سیڑھیوں پر بیٹھا میرا انتظار کرتا ہے، گھر نہ آؤں تو عصائے موسیٰ لے کر سارے شہر میں میری تلاش کرتا ہے، وہ میرے سارے احزاب کا ذمہ دار ہے، میں اسے ایک دن قتل کر دوں گا، وہ مجھے کہتا ہے کہ وہ مجھے اپنے ہاتھ سے دفن کرے گا، اس کے اور میرے درمیان زندہ رہنے کی دوڑ لگی ہوئی ہے کہ کون پہلے کس کو دفن کرتا ہے۔ آپ اس معاملے میں بغاوت کیوں نہیں کرتے؟ میں محبت اور نفرت کے دوہرے رشتے کا اسیر ہوں۔"(۴۵)

اخلاقی عدمیت پسند انسان اخلاقی روایات کو رد کرتا ہے اس کے نزدیک نیکی کا کوئی تصور نہیں ہوتا یہی نظریہ ہمیں کبھی کبھی پروفیسر کے کردار میں دکھایا جاتا ہے جیسے ایک جگہ وہ کہتا ہے کہ

"میں بھی کتنا کمینہ ہوں کہ اپنے مقاصد کے لیے انسانی تعلقات کو آزمائش میں ڈال کر اپنا اور انسانی فطرت کا تمسخر اڑاتا ہوں، اصل میں قصور میرا ہے کہ میں اپنی تربیت کے زیرِ

اثر انسان کو بنیادی طور پر نیک سمجھتا رہا ہوں، شاید اس کا اثر ابھی تک باقی ہے کہ میں بلا سوچے سمجھے توقعات کا پلندہ لے کر کال بیل کے جواب کے منتظر ہوں۔ اب انسانی تجربے نے تنبیہ کی ہے کہ ہر ایک پر اعتماد کرنے کی بجائے شک کرنا چاہیے اور پھر شک کو رفع کرنے کے بعد اعتماد کے بارے میں سوچنا چاہیے۔"(۴۶)

اسی طرح ایک اور جگہ پروفیسر ان نظریات کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے کہ

"چلو، میں نے لوگوں کو رد کر دیا ہے لیکن میں اپنی تمام ذہنی اور تربیتی ساخت کر رد کر کے چوروں اور بدمعاشوں کی جیبوں سے رزق چھین سکتا ہوں؟ کیوں نہیں، چور اور شریف کی حد فاصل مٹ چکی ہے، فی زمانہ کون دیانت دار ہے؟ میں کن اخلاقی ضابطوں میں الجھا ہوں، مجھے جلد از جلد فیصلہ کرنا چاہیے کیونکہ اب زندہ رہنے کے تمام وسائل ختم ہو چکے ہیں۔" (۴۷)

موجودہ اخلاقی نظریات سے انحراف کرتے ہوئے پروفیسر کہتا ہے کہ

"اب میں حصولِ مقاصد کے لیے ہر ذلت کو برداشت کروں گا، میں اب زندگی سے دوچار ہو رہا ہوں، میں زندگی سے روبرو ہوں، میں بھی نئی اخلاقیات کے لباس میں ہوں۔"(۴۸)

پروفیسر ناول میں اخلاقی نظریات کی روایت توڑنے کی خواہش کرتے ہوئے کہتا ہے کہ

"پیرس کے گوگاں نے تاہتی جزائر میں جا کر کپڑے اتار دیے، اس نے اپنی شخصی تہذیب کے ہر تار کو ادھیڑ کر وہاں کے باشندوں جیسی زندگی بسر کی، اس کا سفر تہذیب سے عدمِ تہذیب کی طرف رجعت کا عمل تھا۔ میرا عمل اس سے مختلف ہے، میں دانستہ طور پر یہ سب کچھ کر رہا ہوں، میرے گرد جو نرغہ قائم کیا ہے میں اسے توڑ دوں گا، میں نے اپنی قیمت لگا دی ہے۔" (۴۹)

اسی طرح جب پروفیسر کے بھائی آپس میں گفتگو کرتے ہیں تو وہ کہتا ہے کہ

"میں اپنی وراثت سے انکاری ہوں، نہ صرف اس مکان کی بلکہ ہر اس صورتِ حال کی جس نے مجھے وہ بنا دیا جو میں نہیں ہو، اس لیے میں نے امجد اور رحیم کی گفتگو میں شرکت نہیں کی۔"(۵۰)

انیس ناگی کے ناول میں اور وہ میں اخلاقی عدمیت کے ثرات دکھائی دیتے ہیں۔ اس ناول میں اخلاقی اقدار اور روایات کی نفی کی گئی ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار ناول کے ہر موڑ پر تمام روایات کی نفی کرتا دکھائی دیتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی دکھائی دیتا ہے کہ وہ ان تمام اخلاقی روایات کو رد کرنا چاہتا ہے لیکن یہ معاشرہ اسے کرنے نہیں دیتا جہاں سے بے بسی جنم لیتی ہے۔ مثلاً ایک جگہ مرکزی کردار کہتا ہے کہ:

"وہ میرے ساتھ ندامت اور محدود وسائل کی زندگی بسر کر رہی ہے۔
اوہ! کیسی رسوم ہیں؟ ستی ہونا حماقت ہے۔ ہم اکٹھے رہنے پر مجبور ہیں۔"(۵۱)

اسی طرح ایک جگہ میں کا صیغہ کہتا ہے:

"مجھے انسان کی نیکی پر کبھی یقین نہیں تھا، کم سے کم انسان کی وہ نوع جو یہاں آباد ہے۔
نیکی کے تمام تصورات جو کتابوں میں درج ہیں، باطل ہیں۔"(۵۲)

جب مرکزی کردار جنوبی افریکہ میں اپنے حالات سے فرار حاصل کرنے کے لیے بیٹھا ہوتا ہے تو کہتا ہے کہ:

"مجھے احساس ہے کہ اس کا بدن گداز اور قوت سے معمور ہے، وہ مجھے اپنی تحیل میں لے لے گی۔ لیکن صرف ایک عورت کی طرح گرہستی کے کسی وعدے کے بغیر، مستقبل کی خواہش کے بغیر، پھر ہم دو بچوں کی طرح انسانی نظاموں کو روندتے ہوئے، بے حسی کے شہروں کو پھلانگتے ہوئے ایسے خطے میں نکل جائیں گے جس کا خواب فلسفی دیکھتے ہیں۔"(۵۳)

اسی طرح جب وہ دفتری معمولات میں الجھا ہوتا ہے اور آفسر شاہی کے ہاتھوں مشکلات کا شکار ہوتا ہے تو کہتا ہے کہ:

"میں کسی اخلاقیات کا پابند نہیں ہوں"۔(۵۴)

مرکزی کردار انہی زندگی کی الجھنوں اور مسائل سے دوچار رہتا ہے۔ جب دفتر سے اسے رخصت کر دیا جاتا ہے اور وہ ایک کمرے تنہا بیٹھا ہوتا ہے تو کہتا ہے کہ:

"یہ رشتے ناطے کیا ہیں؟ بنالو تو بن جاتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ بہر حال ہر مرد کو ایک عورت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک عورت یا عورت؟ اس نقطے پر سوچ رک گئی

۔عورت ایک عورت بن سکتی ہے؟ نہیں مجھے ملکیت کا عارضہ نہیں ہے، اولاد نہ بھی ہو تو میری زندگی کون سی تشنہ ہے، اولاد سے گریز ضروری ہے۔"(۵۵)

ناول میں جگہ جگہ گرہستی کی نفی کی گئی ہے اور شادی سے انکار کیا گیا ہے۔ مرکزی کردار شادی کو بے معنی سمجھتا ہے۔ مثلاً:

"واقعی اس شادی میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ یہ عہدِ زوال کی عروسی تھی۔"(۵۶)

ایک اور جگہ مرکزی کردار کہتا ہے:

"میرے لیے اس کا جواب دینا مناسب نہیں تھا، کیونکہ میں نے شادی کسی مقصد کے لیے نہیں کی تھی"۔(۵۷)

اسی طرح ایک اور جگہ کہتا ہے:

"یہاں قیام مختصر ہے، چند دن رہا جا سکتا ہے۔ لیکن میرے ساتھ بیوی اور بچہ موجود ہیں ۔۔۔۔ میں مسرت میں شرکت کرنا چاہتا ہوں، سب کچھ چھوڑ کر سب سے بے اعتنا ہو کر میں بھول جاؤں گا کہ میں اپنے کندھوں پر ایک عہد کا بوجھ لیے پھر رہا ہوں۔۔ ۔۔۔ تمہیں شادی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ یس سر مجھے اپنی غلطی کا احساس ہے"۔(۵۸)

انیس ناگی کے ناول زوال میں بھی اخلاقی عدمیت کے نظریات موجود ہیں اس کا مرکزی کردار احسن ایک بیماری میں مبتلا ہے اور کوئی اس کی دوا نہیں دے رہا ڈاکٹروں نے ایک کاروبار شروع کیا ہوا ہے۔ اسی تمام صورت حال میں احسن جگہ جگہ اخلاقی اقدار اور روایات کو مسترد کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ احسن ازواجگی زندگی سے تنگ ہے اور اسے لگتا ہے کہ یہ سب فضول نظریات ہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ یہ سب ایک جال ہے جس میں انسان پھنستا چلا جاتا ہے۔ اور حاصل کچھ بھی نہیں ہوتا سوائے اذیت کے۔ مثلاً:

احسن نے چند لمحوں کے لیے اپنے بیوی بچوں کے بارے میں سوچنا چاہا لیکن وہ چند لمحوں کے لیے ایسی دنیا چاہتا ہے جو ہر دنیا سے دور ہو"۔(۵۹)

ایک جگہ احسن کہتا ہے:

"اس سوشل آڈر میں شادی لایعنی ہے، تمہیں پتہ ہے کہ ہم دونوں ایک نظریے سے وابستہ ہیں اور ہم جو کچھ کرنا چاہتے ہیں اس میں گرہستی حائل ہے۔"(۶۰)

اس اقتباس میں احسن شادی کے نظریے کو رد کرتا ہے۔ معاشرے میں شادی کے بعد ہی مرد اور عورت کے رشتے کو جائز سمجھا جاتا ہے جبکہ شادی کے بغیر مرد اور عورت کے رشتے کو غیر اخلاقی سمجھا جاتا ہے لہٰذا ناول میں احسن اس نظریے کی مخالفت کرتا ہے۔

انیس ناگی کے ناول دیوار کے پیچھے، میں اور وہ اور زوال میں اخلاقی نظریات کی نفی کی گئی ہے اور ناول کے کرداروں کے ذریعے ان تمام اخلاقی اقدار کو مسترد کیا گیا ہے جو مذہب اور معاشرے نے ترتیب دی ہیں۔ ناول کے کرداروں کے نزدیک یہ سب بے معنی نظریات ہیں۔

ج۔ وجودی عدمیت:

تعریف:

وجودی عدمیت سے مراد ہے کہ زندگی کا کوئی موروثی معنی یا قدر نہیں ہے اور انسان کا موجود بے معنی ہے۔ یہ نظریہ افراد کو سماجی یا مذہبی رووایات اور نظریات سے آزاد کرتا ہے

آغاز وارتقا:

وجودی عدمیت کا آغاز انیسویں صدی میں فریڈرک نطشے اور سورین کیرکگارڈ نے کیا۔

وجودی عدمیت کے نزدیک انسان کو زندگی میں اپنا مقصد خود پیدا کرنا چاہیے کیونکہ زندگی کے کوئی موروثی معنی نہیں ہے۔ یہ نظریہ افراد کو اپنی زندگی کا کنٹرول سنبھالنے اور اپنی مرضی کا انتخاب کرنے کی اجازت دیتا ہے۔

وجودی عدمیت کی تاریخ پیچیدہ اور کثیر جہتی ہے بہت سے مختلف فلسفیوں اور مفکرین نے وقت کے ساتھ ساتھ اس عقیدے کی نشوونما میں اپنا حصہ ڈالا ہے۔ وجودی عدمیت سے وابستہ کچھ اہم شخصیات میں فریڈرک نطشے، سورین کیرکگارڈ، مارٹن ہائیڈیگر اور ژاں پال سارتر شامل ہیں۔ ان تمام فلسفیوں نے وجوی عدمیت کے نظریات پیش کیے۔ تاہم یہ فلسفہ پریشانی یا الجھن کے احساسات کا باعث بھی بن سکتا ہے کیونکہ افراد زندگی میں اپنا راستہ تلاش کرنے کے لیے جدوجہد کرتے ہیں۔ وجودی عدمیت کا آغاز تب ہی ہو گیا تھا جب نطشے نے کہا کہ "خدا مر گیا ہے۔" اس بیان کو اکثر روایتی مذہبی عقائد کی نفی اور انسانی وجود کی موروثی بے

معنویت کی پہچان کے طور پر تعبیر کیا جاتا ہے۔ نطشے کا خیال تھا کہ افراد کو زندگی میں اپنی اقدار اور معانی خود پیدا کرنے چاہییں کیونکہ ان کی رہنمائی کے لیے کوئی معروضی سچائی یا اخلاقیات نہیں ہیں۔ یہ نظریہ وجودی عدمیت کے تصور میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے اور جدید فلسفیانہ فکر کی تشکیل میں اس کا اثر رہا ہے۔

مغرب میں وجودی عدمیت:

فرانز کافکا:

کافکا ایک جرمن زبان کے مصنف ہیں جن کی تحریروں میں لایعنیت، مایوسی اور بے معنی دنیا میں معنی کی تلاش کے موضوعات موجود ہیں۔ ان کے ناول "The Trial" اور "The Castle" دونوں ہی وجودی عدمیت کی بہترین مثالیں ہیں۔

ژاں پال سارتر:

سارتر ایک فرانسیسی فلسفی اور مصنف تھا جو وجودی تحریک سے وابستہ رہا ہے۔ ان کا ناول "متلی" وجودی عدمیت کی ایک بہترین مثال ہے اور یہ ناول بے معنویت، مایوسی اور معنی کی تلاش کے موضوعات کے متعلق ہے۔ سارتر اپنے ناول میں nausea کہتا ہے کہ میں ابھی پارک میں تھا اور موت کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ لیکن یہ ایک تسلی بخش سوچ تھی۔ میرا مطلب یہ تھا کہ میں مرنا چاہتا ہوں۔ یا اگر مرنا نہیں تو دنیا میں تنہا رہنا چاہتا ہوں۔ دنیا میں بالکل اکیلا رہنا چاہتا ہوں۔

البرٹ کامیو:

کامیو ایک فرانسیسی مصنف اور فلسفی تھا جو وجودی عدمیت کی تحریک سے وابستہ رہا ہے۔ ان کا ناول "The Stranger" وجودی عدمیت کی ایک بہترین مثال ہے اور اس میں بیگانگی، مایوسی، اور ایک بے معنی دنیا میں معنی کی تلاش کے موضوعات کو تلاش کیا گیا ہے۔، مثلاً مرسو کہتا ہے میں نے تب محسوس کیا کہ جو آدمی صرف ایک دن جیتا ہے وہ جیل میں سو سال تک با آسانی زندہ رہ سکتا ہے۔ اس کے پاس اتنی یادیں ہوں گی کہ وہ اسے بور ہونے سے روک سکیں گی۔ ناول اجنبی کے اس اقتباس سے وجودی عدمیت ظاہر ہو رہی ہے۔ مرسو کو اس جرم کی سزا دی جا رہی جو اس نے سرزد نہیں کیا۔ اس وقت مرسو کو وجودی عدمیت کا احساس ہوتا ہے کہ وجود کتنا بے معنی ہے۔

اسی طرح دوستوفسکی کا ناول notes from underground کا مرکزی کردار کہتا ہے کہ

میں ایک بیمار آدمی ہوں. میں ایک غصہ کرنے والا آدمی ہوں، میں ایک ناخوشگوار آدمی ہوں... مجھے اس کے بارے میں معمولی سی بات بھی نہیں معلوم اور میں اسے تسلیم کرنے کے لیے بالکل تیار ہوں لیکن پھر بھی میں ایک آدمی ہوں۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ میں خود اپنی بوریت کا خود ذمہ دار ہوں۔ناول کا مرکزی کردار اس اقتباس میں اپنے وجود کی بے معنویت کا احساس دلاتا ہے۔ البرٹ کامیو اپنی کتاب دی ریبل میں وجودی عدمیت کو اس طرح واضح کرتا ہے کہ باغی ایک مابعد الطبیعاتی غدار ہے، ایک ایسا آدمی جو کائنات کو نہیں کہتا۔ لیکن ساتھ ہی وہ واحد شخص بھی ہے جو ہاں کہہ سکتا ہے، کیونکہ اس کے پاس تخلیق کرنے کی طاقت ہے۔ یہ باغی ہے جو کائنات کو تخلیق کرتا ہے۔ دنیا، اور یہ دنیا ہی ہے جو باغی پیدا کرتی ہے۔ یہ حوالہ کامیو کے اس یقین کی عکاسی کرتا ہے کہ جمود کے خلاف بغاوت انسانی آزادی اور تخلیقی صلاحیتوں کے لیے ضروری ہے، لیکن یہ کہ بغاوت کا عمل بالآخر فضول اور بے معنی ہے۔ ژاں پال سارتر اپنے ڈرامے "نو ایگزٹ" میں کہتا ہے کہ " جہنم دوسرے لوگ ہیں۔" سارتر کے ڈرامے کی یہ مشہور سطر اس کے اس عقیدے کی عکاسی کرتی ہے کہ انسان بنیادی طور پر الگ تھلگ اور تنہا ہے، اور یہ کہ دوسروں کی موجودگی اس وجودی سچائی کو اجاگر کرنے کا کام کرتی ہے۔

اردو میں وجودی عدمیت:

اردو ادب میں وجودی عدمیت کے نظریات ہمیں بہت سے مصنفین کی تحریروں میں دکھائی دیتے ہیں۔ تقسیمِ ہند، مشرقی پاکستان اور ملک میں بار بار مارشل لاء کا نافذ ہونا یہی وہ صورتِ حال تھی جس نے وجودی عدمیت کو جنم دیا اور مصنفین نے اسے اپنا موضوعِ تحریر بنایا۔ جن مصنفین کی تحریروں میں وجودی عدمیت کے نظریات دکھائی دیتے ہیں وہ درج ذیل ہیں:

سعادت حسن منٹو:

منٹو کا شمار اردو کے معروف ادیبوں میں ہوتا ہے اور ان کی تحریروں میں وجودی عدمیت کے نظریات دکھائی دیتے ہیں۔ اس کی کہانیوں میں اکثر ایسے کرداروں کو دکھایا جاتا ہے جو ایک ایسی دنیا میں معنی

اور مقصد تلاش کرنے کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں جو ان کی حالت زار سے لاتعلق نظر آتی ہے۔ مثلاً منٹو ایک جگہ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں لکھتا

ہے:

"دنیا ایک تاریک اور خالی جگہ ہے، سائے اور سرابوں سے بھری ہوئی ہے۔ ہم سب قسمت کے ہاتھ کی کٹھ پتلیاں ہیں اور ایسی دھن پر ناچ رہے ہیں جسے ہم سن نہیں سکتے۔"(۶۱)

منٹو کھول دو میں لکھتا ہے:

"کائنات ایک وسیع اور خالی خلا ہے، ایک ایسی جگہ جہاں زندگی کا کوئی مطلب یا مقصد نہیں ہے۔ ہم سب صرف خاک کے دھبے ہیں اور خلا کی لامتناہی وسعت میں تیر رہے ہیں"۔(۶۲)

منٹو منٹونامہ میں لکھتا ہے:

"زندگی ایک لمحہ بہ لمحہ وہم ہے۔ ایک خواب ہے جسے ہم حقیقت سمجھ کر بھول جاتے ہیں۔ ہم سب ایک سٹیج پر صرف اداکار ہیں اور ایک بے معنی ڈرامے میں اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔"(۶۳)

عصمت چغتائی:

چغتائی اردو کی ایک معروف مصنفہ ہیں جنہوں نے اپنی تحریروں میں وجودی عدمیت کے تصورات بیان کیے ہیں۔ اس کی کہانیاں اکثر ایسے کرداروں کی عکاسی کرتی ہیں جو ایک ایسی دنیا میں معنی اور مقصد تلاش کرنے کی جدوجہد کر رہے ہیں جو ان کی حالت زار سے لاتعلق نظر آتی ہے۔

انتظار حسین:

حسین اردو کے ایک اور ممتاز مصنف ہیں جنہوں نے اپنے کام میں وجودی عدمیت کے نظریات کو بیان کیا ہے۔ اس کی کہانیوں میں اکثر ایسے کرداروں کی تصویر کشی کی جاتی ہے جو اپنے وجود کے بے معنی ہونے کے لیے جدوجہد کر رہے ہوتے ہیں۔

احمد ندیم قاسمی:

قاسمی اردو کے ایک اور ممتاز مصنف ہیں جنہوں نے اپنے کام میں وجودی عدمیت کے تصورات بیان کیے ہیں۔ اس کی کہانیوں میں اکثر ایسے کرداروں کی تصویر کشی کی جاتی ہے جو اپنے وجود کے بے معنی ہونے کے لیے جدوجہد کر رہے ہوتے ہیں۔

انیس ناگی کے ناولوں میں وجودی عدمیت:

انیس ناگی کے ناولوں میں وجودی عدمیت کے بہت زیادہ اثرات ہیں۔ جس کی بہت سی وجوہات ہیں۔ پہلی تو یہ کہ انہوں نے مغربی مفکرین کی تحریروں کے ترجمے کیے، وہ کامیو اور کافکا جیسے مفکرین سے بہت متاثر تھے اور دوسری وجہ اس وقت کا سیاسی منظر نامہ تھا۔ جس نے وجود کی اہمیت ختم کر دی اور انسان کو اپنا وجود بے معنی لگنے لگا۔ ہر طرف ظلم و ستم کی داستان رقم کی جارہی تھی جس نے انسان کے جودی بحران کو جنم دیا اور جس نے انسان کو وجود کی اہمیت سے انکار کرنے پر مجبور کیا۔

انیس ناگی کے ناول دیوار کے پیچھے میں وجودی عدمیت کے بہت سے اثرات موجود ہیں۔ دیوار کے پیچھے کا مرکزی کردار پروفیسر ہر موڑ پر اپنے وجود کی اہمیت سے انکار کرتا ہے اور اسی کشمکش میں وہ خودکشی کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر وہ ناکام رہتا ہے۔ اور یہی ناکامی اسے یہ سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ اس کا وجود کتنا بے معنی ہے کہ موت نے بھی اسے قبول نہیں کیا۔ مثلاً پروفیسر کہتا ہے کہ:

> "یہ ناانصافی کس نے کی ہے؟ یہ ناانصافی کسی ایک فرد نے نہیں کی، سب نے مل جل کر کی ہے۔ میں ایک مدت سے یہاں اچھوتوں کی زندگی بسر کر رہا ہوں، میں ہر اعتبار سے کٹا ہوا اور تنہا ہوں، علیحدگی کی یہ سزا میرے اندر الوالعزمی نہیں پیدا کر سکی۔"[۶۴]

اسی طرح آگے چل کر کہانی کے ہر موڑ پر وہ یہی کہتا ہے کہ اس کا وجود بے معنی ہے۔ ایک اور جگہ کہتا ہے:

> "انسان کے طور پر اتنا مجرم نہیں ہوں، میں نے نہ اس زندگی کو شروع کیا ہے اور نہ ہی اسے کسی منطقی یا غیر منطقی انجام تک پہنچانے کا اہل ہوں۔"[۶۵]

ایک اور جگہ پروفیسر کہتا ہے کہ

"آج میں بہت فارغ تھا اور ذہن ہر مصروفیت سے عاری تھا، چنانچہ میں نے اس شہر کے ان تمام مقامات کی زیارت کی جو کبھی میری زندگی کا حصہ تھے، میں نے ان مقامات کو دوبارہ دیکھا جہاں سے کبھی میرا بچپن گزرا تھا وہ تمام کے تمام اتنے بدل چکے تھے کہ کسی نے بھی مجھے نہ پہچانا۔"(۶۶)

اسی طرح ملازمت کے جانے بعد پروفیسر سڑک پر ٹہلتے ہوئے سوچتا ہے کہ

"اے رات میرا راستانہ روک، میں مشکوک کے باوجود ایک شہری ہوں، زندگی کا حق رکھتا ہوں۔"(۶۷)

ملازمت جانے کے بعد پروفیسر کو یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کی شخصی آزادی کو مسخ کرکے اس کی وجودی اہمیت کو ختم کیا جارہا ہے۔ مثلاً پروفیسر خود کلامی کرتے ہوئے کہتا ہے کہ

"پرنسپل بھی مجھے مخبر معلوم ہوتا ہے اسے کیسے پتہ چلا کہ میں مشکوک ہوں، میں یقیناً مشتبہ ہوں کہ میرا تعاقب کیا جارہا ہے، اس واقعے کے بعد میری آنکھیں کھلی ہیں کہ میرے خلاف سازش کا جال کافی دیر سے بنا جارہا تھا اور میں اس حقیقت سے بے خبر بڑے اطمینان سے نارمل زندگی بسر کر رہا تھا، مجھے اب احساس ہوا کہ کالج اور ریستوران میں جان بوجھ کر ایسے موضوعات پر رائے زنی پر اکسایا جاتا تھا جن کے جارے میں آج سرگوشی میں بات کی جاتی ہے، میں اس سازشی ماحول کی اہمیت سے بے خبر تھا"۔(۶۷)

اسی طرح ایک اور جگہ پروفیسر کہتا ہے کہ

"ایک شخص ہی میرا تعاقب کرتا ہے البتہ وہ اپنا حلیہ بدلتا رہتا ہے۔ ان قرائن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ میری نگرانی کی جانی ضروری ہے، میرے علاوہ اور بہت سے لوگوں کی نگرانی کی جاتی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ گھر سے کوئی کھلے بندوں نہیں پھرتا۔ اس کی اور میری جیب میں، ایک ہی مقام اور ایک ہی وقت پر پہنچنے کے دعوت نامے ہوتے ہیں، میں یقیناً کسی سازش کا شکار ہوں، میں بہت قیمتی موتی ہوں کہ جس کی حفاظت کو ضروری سمجھا گیا"۔(۶۸)

ایک اور جگہ پروفیسر کہتا ہے کہ

"یقیناً میرے زمانے کو مجھ جیسے شخص کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ میں نے اس کے وجود سے انکار کیا تھا اس نے اب میرے وجود کی نفی کی ہے، میں آفرینش سے پہلے نفی تھا، میں موت کے بعد نفی ہو جاؤں گا، میں نے اپنے وجود کے ذریعے دو منفی نقطوں کو آپس میں متصل کیا ہے"۔ (۶۹)

پروفیسر ناول میں جگہ جگہ وجودی عدمیت کا اظہار کرتا ہے۔ وہ ناول میں جگہ جگہ وجود کی اہمیت سے انکار کرتا ہے۔ جیسے وہ کہتا ہے کہ

"میں نے ان مقامات کو دوبارہ دیکھا جہاں سے کبھی میرا بچپن گزرا تھا وہ تمام کے تمام اتنے بدل چکے تھے کہ کسی نے بھی مجھے نہیں پہچانا"۔ (۷۰)

وجود کی اہمیت کو رد کرتے ہوئے پروفیسر کہتا ہے کہ

"ایک ہی شخص میرا تعاقب کرتا ہے البتہ وہ اپنا حلیہ بدلتا رہتا ہے۔ ان قرائن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ میری نگرانی کی جانی ضروری ہے۔ میرے علاوہ اور بہت سے لوگوں کی نگرانی بھی کی جاتی ہو گی۔ میرا خیال ہے کہ تمام اہم افراد کی بھی نگرانی کی جاتی ہے، اس مطلب یہ ہے کہ گھر سے باہر کوئی بندوں نہیں پھر سکتا۔ اس کی اور میری جیب میں، ایک ہی مقام اور ایک ہی وقت پر پہنچنے کے دعوت نامے ہوتے ہیں، میں یقیناً کسی سازش کا شکار ہوں، اس صورت میں زندہ رہنا محال ہے۔" (۷۱)

ناول میں اکثر کردار وجودی عدمیت پسند دکھائی دیتے ہیں۔ جیسے حمید کہتا ہے کہ

"اوہ ہو، وہ تو بہت پرانی بات ہے، مجھے یاد آیا تمہارے ساتھ بہت زیادتی کی گئی ہے۔ بس دیکھ لو نزلہ مجھ پر ہی گرنا تھا۔ تمہارے خلاف کس نے سازش کی ہے؟ ہاں، اس زمانے نے کی ہے۔" (۷۲)

نوکری کے جانے کے بعد پروفیسر کو احساس ہوتا ہے کہ اس کا وجود کتنا غیر اہم ہے۔ جیسے کہتا ہے کہ

"میری آفادیت ختم ہو چکی ہے، اگرچہ پہلے بھی بطور لیکچرار میں چنداں آفادیت کا حامل نہیں تھا، تاہم کھوٹے پیسے کی طرح امتحانوں میں کام آتا تھا۔ اب میرے سے میری آفادیت معدوم ہو چکی ہے، بعض دفعہ مجھے اپنے آپ سے گھن آنے لگتی ہے کہ میں واقعی اتنا ناکارہ ہو چکا ہوں کہ اپنے کام بھی نہیں آسکتا۔ دراصل میرا اپنے آپ سے رشتہ بھی فادی قدروں کے زیرِ اثر آچکا ہے۔ میرا اپنے آپ سے تعلق ثانوی ہو چکا ہے یہ

میرے شخصی زوال کا ایک جزو ہے میں نے اپنے تقاضوں کو ضروریات کے نیچے کچل دیا ہے۔ دراصل میرے ساتھ ناانصافی کی گئی ہے میں اس کا مستحق نہیں تھا۔"(۷۳)

ایک اور جگہ کہتا ہے کہ

"میرے لیے اس زمین میں کوئی کشش نہیں ہے، کشش ثقل کے تمام اصول باطل ہیں۔ میرا وزن نہ ہونے کے برابر ہے پھر بھی زمین میرے بوجھ کو ضرورت سے زیادہ محسوس کر رہی ہے، وہ پہاڑوں، گناہوں اور فرعونوں کا باجھ اٹھا سکتی ہے صرف میرا وجود ہی اسے ۔۔۔۔۔۔ اے زمین تیری وسعتیں لامحدود ہیں۔"(۷۴)

ناول کا مرکزی کردار اپنے بارے میں کہتا ہے کہ میرا وجود بے معنی ہے۔ جیسے کہتا ہے کہ

"میں نے وہ بیمار بھی دیکھے ہیں جو کسی امید کے بغیر مسلسل مایوسی میں زندہ رہتے ہیں، دونوں صورتوں میں دونوں زندہ رہتے ہیں۔ لیکن میں نہ زندوں میں ہوں نہ مردوں میں۔ میں اپنی تشخیص کے لیے کس کے پاس جاؤں؟ اگر جاؤں بھی تو کیا کہوں؟ وہ پوچھے گا عارضہ کیا ہے؟ میں چپ رہوں گا، وہ مجھے غور سے دیکھ کر ہنسے گا کہ میں مخبوط الحواس ہوں اور پھر اپنا سٹھیتو سکوپ کسی اور کے سینے پر رکھ کر میرے وجود سے لاتعلق ہو جائے گا۔(۷۵)

اسی طرح ایک اور جگہ کہتا ہے کہ

"میں یقیناً یہ جنگ ہار چکا ہوں، میرے جملہ وسائل دم توڑ رہے ہیں، اب شدید مالی بحران مایوسی، مایوسی اور دل گرفتگی ہے۔ یہ تمام دوڑ تعلقات کی ہے، رزق کا حصول میرا حق نہیں ہے، اب یہ ایک مراعت بن چکی ہے، یہ میرے امتحان کی گھڑی ہے، صبر اور صبر ! مجھے پیٹ پر پتھر باندھنا چاہیے۔"(۷۶)

ایجنسیوں کے افراد کے ہاتھوں جب پروفیسر کا استحصال ہوتا تو وہ وجود کو رد کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً کہتا ہے کہ

"میں مجرم نہیں ہوں، میں نے کچھ نہیں کیا، یہ میرا پیدائشی احساسِ جرم نہیں ہے، میں اس کی بیماری کا ذمہ درار نہیں ہوں، میں تو خود بیمار ہوں، یہ سارا عہد بیمار ہے اور کسی کو یہ بھی نہیں پتہ کہ کون کیوں بیمار ہے؟ یہ شہر بیماروں کا ہسپتال ہے، یہ طاعون ہے، بیٹھے

، بیٹھے ایک دم جسم پھٹنے لگتا ہے اور ذہن کی طنابیں ٹوٹ جاتی ہیں۔ قابیل نے خدا سے کہا تھا: میری سزا برداشت سے باہر ہے، خدا نے اس معاف نہیں کیا اور کہا: جو قابیل کو قتل کرے اس سے سات گنا بدلہ لیا جائے۔۔۔۔۔۔ اور خدا نے قابیل کے لیے ایک نشان ٹھہرایا کہ کوئی اسے پاکر کوئی مار نہ ڈالے۔۔۔ قاتل کا تحفظ کیا گیا لیکن میں منکر ہوں میرا کوئی ساتھی نہیں ہے، کوئی ضابطہ میری حفاظت کے لیے آمادہ نہیں ہے، ہر طرف خلا ہی خلا ہے، میں نے اسے مقدر کے طور پر قبول کیا ہے۔"(۸۰)

چوہدری نے جب پروفیسر کو چھان بین کے لیے کہا تو وہ وجودی اہمیت سے انکار کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ جیسے کہتا ہے کہ

"میں انہیں کیسے شناخت کروں؟ میں تو ابھی تک اپنی شناخت نہیں کر سکا ہوں۔"(۸۱)

ناول میں اور وہ میں بھی مرکزی کردار وجودی عدمیت کا قائل ہے۔ دفتری معاملات، معاشی مسائل اور سیاسی صورتِ حال اسے وجودی عدمیت کے نظریات ماننے پر مجبور کرتے ہیں۔ وہ انہی معاملات کی وجہ سے کمرے میں بند ہو کر رہ جاتا ہے۔ کبھی ملک سے باہر جاتا ہے اور جب باہر سے واپس آتا ہے تو تمام ادارے اسے شک کی نگاہ سے دیکھتے جس کی وجہ سے وہ خود کو غیر اہم سمجھنے لگتا ہے۔ اسے اپنا وجود بے معنی لگنے لگتا ہے وہ وجود کی اہمیت کو مسترد کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کے وجود کے کوئی معنی نہیں۔ جیسے ایک جگہ کہتا ہے:

"آج سے دو سال پہلے میں کسی قسم کی زندگی کا طرفدار نہیں تھا۔ میرا وجود اتنا مہمل اور بے اثر تھا کہ میں کسی کو فائدہ یا نقصان پہنچانے کے لیے اہلیت نہیں رکھتا۔"(۸۲)

اسی طرح جب وہ الجزائر میں ہوتا ہے تو کہتا ہے:

"میں اپنے آپ کو اس زندگی کی بھینٹ نہیں چڑھاؤں گا جس کا ماخذ میں نہیں ہوں۔"(۸۳)

ناول زوال میں بھی وجودی عدمیت کے نظریات موجود ہیں۔ اس ناول کی کہانی ہی احسن کے وجود کے زوال کی ہے۔ ناول کا مرکزی کردار ایک مہلک مرض میں مبتلا ہے جس کی تشخیص نہیں ہو پاتی۔ وہ اسی بے چینی اور اذیت میں مبتلا رہتا ہے۔ اور آہستہ آہستہ وہ جسمانی طور پر کمزور ہو تا جاتا ہے۔ جس سے اسے یہ احساس ہو تا ہے کہ اس کا موجود کتنا بے معنی اور غیر اہم ہے۔ ناول کے اختتام میں احسن ایک آنکھ سے محروم

ہو جاتا ہے۔ اس کے باقی دونوں دوستوں کا بھی انجام برا ہوتا ہے ایک کو نظام مار دیتا ہے اور دوسرا خودکشی کر لیتا ہے۔ جس سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ انسانی وجود کی کوئی وقعت نہیں۔ جیسے ایک جگہ احسن کہتا ہے:

"کن معمولات کا اسیر ہوں؟ میرے لیے دنیا کتنی سکڑ گئی ہے، ٹی ایس ایلیٹ کے گیند کی طرح چوہدری کی کھوپڑی کی طرح جو میری طرح اپنے افسر سے خائف ہے۔ لیکن اس نے صبح صبح مجھے طلب کر کے میرے وجود کی توہین کی ہے۔ وجود کی کوئی حیثیت نہیں ----"(۸۴)

ایک اور جگہ احسن کہتا ہے:

"میری موجودہ حالت اگر آفت نہیں تو کیا ہے؟ سب کچھ اپنی اپنی جگہ پر رک گیا ہے۔ میرا کوئی وجود نہیں---"(۸۵)

اس اقتباس میں احسن انسان کے وجود کو رد کرتا ہے اس کے نزدیک انسان کے وجود کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اس کا وجود بے معنی ہے۔ وہ معاشرے میں ایک پتلے کی حیثیت رکھتا ہے اور اپنی زندگی کے فیصلوں میں آزاد نہیں ہے۔ معاشرہ اسے اپنے شکنجے میں جکڑے رکھنا چاہتا ہے۔ انسان کو معاشی، سماجی، مذہبی اور اخلاقی نظریات زنجیروں میں جکڑ لیتے ہیں اور اسے بے بس اور لاچار بنا دیتے ہیں جس کی وجہ سے اسے اپنا وجود بے معنی اور بے مقصد لگتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ سعادت حسن منٹو، ٹوبہ ٹیک سنگھ، www.rekhta.org، ۱۲/ اکتوبر ۲۰۲۲ء، بہ وقت ۳ بجے دن

۲۔ عصمت چغتائی، لحاف، روہتاس بکس، لاہور، ۱۹۹۲ء، ص ۲۰

۳۔ ایضاً، ص ۲۲

۴۔ ایضاً، ص ۲۱

۵۔ انتظار حسین، بستی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۸۰ء، ص ۷۰

۶۔ منشی پریم چند، گئودان، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۸۸ء، ص ۵۰

۷۔ انیس ناگی، دیوار کے پیچھے، زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور، ۱۹۸۳ء، ص ۴۴

۸۔ ایضاً، ص ۲۳

۹۔ ایضاً، ص ۵۹

۱۰۔ ایضاً، ص ۲۳

۱۱۔ ایضاً، ص ٦٦

۱۲۔ ایضاً، ص ۴۷

۱۳۔ انیس ناگی، میں اور وہ، عالمین پبلی شرز، لاہور، ۱۹۸۴ء، ص ۱۸

۱۴۔ ایضاً، ص ۲۴

۱۵۔ ایضاً، ص ۲۵

۱٦۔ ایضاً، ص ۲۰۴

۱۷۔ ایضاً، ص ۴۱

۱۸۔ ایضاً، ص ۲٦

۱۹۔ ایضاً، ص ۴۵

۲۰۔ ایضاً، ص ۲٦

۲۱۔ ایضاً، ص ۴۱

۲۲۔ ایضاً، ص ۴۵

۲۳۔ ایضاً، ص ۴۵

۲۴۔ ایضاً، ص۶۶

۲۵۔ ایضاً، ص۲۹۹

۲۶۔ ایضاً، ص۵۵

۲۷۔ انیس ناگی، زوال، فیروز سنز پبلی شرز، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص۴۵

۲۸۔ ایضاً، ص۴۴

۲۹۔ ایضاً، ص۹۹

۳۰۔ Gideon Baker, Nihilism and philosophy, Bloomsbury academic, united kingdom,2018,p80

۳۱۔ عصمت چغتائی، لحاف، روہتاس بکس، لاہور، ۱۹۹۲ء، ص۲۰

۳۲۔ انیس ناگی، دیوار کے پیچھے، زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور، ۱۹۸۳ء، ص۷۶

۳۳۔ ایضاً، ص۱۲۳

۳۴۔ ایضاً، ص۱۵۱

۳۵۔ ایضاً، ص۷۶

۳۶۔ ایضاً، ص۸۸

۳۷۔ ایضاً، ص۶۵

۳۸۔ ایضاً، ص۶

۳۹۔ ایضاً، ص۴۷

۴۰۔ ایضاً، ص۴۹

۴۱۔ ایضاً، ص۴۹

۴۲۔ ایضاً، ص۵۷

۴۳۔ ایضاً، ص۹۴

۴۴۔ ایضاً، ص۱۱۳

۴۵۔ ایضاً، ص۱۳۷

۴۶۔ انیس ناگی، میں اور وہ، عالمین پبلی شرز، لاہور، ۱۹۸۴ء، ص۱۴۸

۴۷۔ ایضاً، ص ۴۴

۴۸۔ ایضاً، ص ۱۰۰

۴۹۔ ایضاً، ص ۳۹

۵۰۔ ایضاً، ص ۶۹

۵۱۔ ایضاً، ص ۷۷

۵۲۔ ایضاً، ص ۸۸

۵۳۔ ایضاً، ص ۹۵

۵۴۔ انیس ناگی، زوال، فیروز سنز پبلی شرز، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۵۶

۵۵۔ سعادت حسن منٹو، ٹوبہ ٹیک سنگھ، www.rekhta.org، ۱۲/ اکتوبر ۲۰۲۲ء، بہ وقت ۳ بجے دن

۵۶۔ سعادت حسن منٹو، کھول دو، www.rekhta.org، ۲۳/ جنوری ۲۰۲۲ء، بہ وقت ۴ بجے دن

۵۷۔ سعادت حسن منٹو، منٹو نامہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۶۵ء، ص ۶۱

۵۸۔ انیس ناگی، دیوار کے پیچھے، زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور، ۱۹۸۳ء، ص ۶۵

۵۹۔ ایضاً، ص ۱۰۲

۶۰۔ ایضاً، ص ۸۷

۶۱۔ ایضاً، ص ۹۸

۶۲۔ ایضاً، ص ۱۰۹

۶۳۔ ایضاً، ص ۱۰۶

۶۴۔ ایضاً، ص ۶۷

۶۵۔ ایضاً، ص ۱۲

۶۶۔ ایضاً، ص ۴۱

۶۷۔ ایضاً، ص ۴۴

۶۸۔ ایضاً، ص ۷۷

۶۹۔ ایضاً، ص ۸۰

۷۰۔ ایضاً، ص ۸۴

۷۱۔ ایضاً، ص۱۰۲

۷۲۔ ایضاً، ص۱۲۹

۷۳۔ ایضاً، ص۱۳۷

۷۴۔ ایضاً، ص۶۵

۷۵۔ ایضاً، ص۲۲۱

۷۶۔ ایضاً، ص۲۳۴

۷۷۔ ایضاً، ص۶۷

۷۸۔ ایضاً، ص۸۹

۷۹۔ انیس ناگی، میں اور وہ، عالمین پبلی شرز، لاہور، ۱۹۸۴ء، ص۱۰۴

۸۰۔ ایضاً، ص۱۰۱

۸۱۔ انیس ناگی، زوال، فیروز سنز پبلی شرز، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص۸۷

۸۲۔ ایضاً، ص۳۲

۸۳۔ ایضاً، ص۵۷

باب سوم:

انیس ناگی کے ناولوں میں لایعنیت کے اثرات

لایعنیت ایک فلسفانہ اور ادبی تحریک ہے جو بیسویں صدی کے وسط میں ابھری۔ یہ اس خیال پر مبنی ہے کہ انسان ایک بے معنی اور غیر معقول کائنات میں موجود ہے اور زندگی میں معنی یا مقصد تلاش کرنے کی کوششیں بالآخر بے سود ہیں۔ لایعنیت اکثر وجودیت کے ساتھ منسلک کی جاتی ہے لیکن ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ لایعنیت میں معنی کی تلاش کے بجائے انسانی حالت کے لغو ہونے پر زور دیا جاتا ہے۔

لایعنی ادب اکثر ایسے کرداروں کو پیش کرتا ہے جو ایسے حالات میں پھنس جاتے ہیں جو عجیب و غریب، لغو یا غیر منطقی ہوتے ہیں۔ یہ کردار اپنی زندگی میں معنی یا مقصد تلاش کرنے کے لیے جدوجہد کرتے ہیں لیکن ان کی کوششوں کو اکثر ناکامی یا مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لایعنی ادب کی سب سے مشہور مثالوں میں سے ایک سیموئل بیکٹ کا ڈرامہ "وٹینگ فار دی گوڈوٹ" ہے جس میں دو کردار ایک پراسرار شخصیت کا انتظار کر رہے ہیں جو کبھی نہیں آتی۔ لاایعنیت کا تعلق ایک ایسے ہیرو سے ہوتا ہے جو زندگی کی بے معنویت کو قبول کرتا ہے اور اس کے خلاف جدوجہد میں معنی تلاش کرتا ہے۔ لایعنی ہیرو روایتی اقدار یا عقائد کو مسترد کرتا ہے اور معاشرے کے خلاف بغاوت کی کارروائیوں میں ملوث رہتا ہے۔ مجموعی طور پر ایک ایسا فلسفہ ہے جو انسانی وجود کی بے معنویت پر زور دیتا ہے اور افراد کو زندگی کی بے معنویت کو قبول کرنے کی ترغیب دیتا ہے بجائے اس کے کہ اس میں معنی یا مقصد تلاش کرنے کی کوشش کریں۔

جن مصنفین کی تحریروں میں لایعنیت کے اثرات موجود ہیں وہ درج ذیل ہیں:

ا۔ سیموئل بیکٹ (Samuel Beckett):

بیکٹ سب سے مشہور لایعنی مصنف ہیں جن کے ڈراموں "وٹینگ فار دی گوڈوٹ" اور "اینڈ گیم" کے ساتھ ساتھ ان کے ناولوں "مولائے،" "مالون ڈیز" اور "دی بے نامیبل" میں لایعنیت کے عناصر موجود ہیں۔ بیکٹ کے ڈرامے وٹینگ فار دی گوڈوٹ میں دونوں کرداروں کا یہ مکالمہ لایعنیت کو اجاگر کرتا ہے:

ولادیمیر: ہم گوڈوٹ کا انتظار کر رہے ہیں۔

ایسٹراگون: (مایوسی سے)۔ آہ! (توقف۔) آپ کو یقین ہے کہ یہ یہاں تھا؟

ولادیمیر: کیا؟

ایسٹراگون: کہ ہمیں انتظار کرنا تھا۔

ولادیمیر: اس نے درخت سے کہا۔ (وہ درخت کی طرف دیکھتے ہیں۔) کیا آپ کو کوئی اور نظر آتا ہے؟

ایسٹراگون: یہ کیا ہے؟

ولادیمیر: مجھے نہیں معلوم۔ ایک ولو۔

ایسٹراگون: پتے کہاں ہیں؟

ولادیمیر: یہ مر چکا ہو گا۔"

۲۔ کافکا(Franz Kafka):

کافکا کو اکثر وجودیت کے ساتھ منسلک کیا جاتا ہے لیکن اس کی تحریروں میں لایعنیت کے بہت سے عناصر بھی شامل ہیں۔ ان کے ناول "The Trial" اور "The Castle" خاص طور پر بیوروکریسی اور سماجی اداروں کی بے معنویت کے اعتبار سے قابل ذکر ہیں۔ مثلاً کافکا اپنے افسانے میٹا فر میں لکھتے ہیں:

"When Gregor Samsa woke up one morning from unsettling dreams, he found himself changed in his bed into a monstrous vermin. He was lying on his back as hard as armor plate, and when he lifted his head a little, he saw his vaulted brown belly, sectioned by arch-shaped ribs, to whose dome the cover, about to slide off completely, could barely cling. His many legs, pitifully thin compared with the size of the rest of him, were waving helplessly before his eyes."[1]

سارتر:

سارتر نو ایگزٹ میں لکھتا ہے:

"Estelle: (screaming) I can't bear it any longer! (She runs to Garcin) Hold me! Hold me tight!
Garcin: (embracing her) There, there. You'll feel better in a minute.
Estelle: (struggling to free herself) I don't want to be held by a man! Never again! Do you hear? Never again![۲]

۳۔البیر کامیو(Albert camus):

کامیو کو لایعنیت کی سب سے مؤثر آواز قرار دیا جاتا ہے جو پہلے وجودیت سے منسلک رہے لیکن بعد میں انہوں نے لایعنیت کو ایک تھیوری کے طور پر اپنے مضمون"The Myth of Sisyphus" میں متعارف کروایا۔ان کے ناولوں میں لایعنیت کے بہت سے عناصر شامل ہیں۔ان کا ناول"The Stranger" انسانی وجود کی بے معنویت کی عمدہ مثال ہے۔جیسے کامیو نے دی متھ آف سیسیفس میں لکھا ہے:

"Thus I draw from the absurd three consequences, which are my revolt, my freedom, and my passion. By the mere activity of consciousness I transform into a rule of life what was an invitation to death - and I refuse suicide. I know, to be sure, the dull resonance that vibrates throughout these days. Yet I have but a word to say: that it is necessary. But that is not enough. I also proclaim that it will be. This world in itself is not reasonable, that is all that can be said. But what is absurd is the confrontation of this irrational and the wild longing for clarity whose call echoes in the human

heart. The absurd depends as much on man as on the world.

For the moment it is all that links them together."[۳]

4۔(Eugène Ionesco):

ایک رومانوی فرانسیسی ڈرامہ نگار تھا جو تھیٹر آف دی ایبسرڈ سے وابستہ رہا۔ ان کے ڈرامے "The Bald Soprano" اور "Rhinoceros" لایعنیت کے اعتبار سے قابل ذکر ہیں۔ مثلاً "The Bald Soprano" مسز سمتھ اور مسٹر سمتھ کے یہ مکالمے لایعنیت کی عکاسی کرتے ہیں:

"Mrs. Smith: I am a cauliflower.

Mr. Smith: And I am a human being.

Mrs. Smith: That's a matter of opinion. Personally, I think you're a bracket.

Mr. Smith: A bracket? What makes you say that?

Mrs. Smith: Your nose. It's like a bracket. And your ears are like parentheses.[۴]"

5۔ہیرالڈ پنٹر(Harold Pinter):

پنٹر ایک برطانوی ڈرامہ نگار تھا جو تھیٹر آف دی ایبسرڈ سے وابستہ رہا۔ ان کے ڈرامے "دی برتھ ڈے پارٹی" اور "دی کیئر ٹیکر" لایعنیت کے لیے قابل ذکر ہیں۔

۶۔جین جینیٹ(Jean Genet)

جینیٹ ایک فرانسیسی ناول نگار، ڈرامہ نگار، اور شاعر تھا جو اکثر تھیٹر آف دی ایبسرڈ سے وابستہ رہا ہے۔ان کے ڈرامے "دی بالکونی" اور "دی بلیکز" لایعنیت کے اعتبار سے اہم ہیں۔

۷۔ٹام اسٹاپپارڈ(Tom Stoppard)

اسٹاپپارڈ ایک برطانوی ڈرامہ نگار ہے جو تھیٹر آف دی ایبسرڈ سے وابستہ تھا۔ ان کے ڈرامے "Rosencrantz and Guildenstern Are Dead" اور "The Real Inspector Hound"

خاص طور پر شناخت اور لایعنیت کے اعتبار سے اہم ہیں۔ٹام کے ناول Rosencrantz and "Guildenstern Are Dead" میں دونوں کرداروں کے مابین یہ مکالمہ لایعنیت کی مثال ہے:

> "Rosencrantz: We might as well be dead. Do you think death could possibly be a boat?
>
> Guildenstern: No, no, no... Death is... not. Death isn't. You take my meaning. Death is the ultimate negative. Not-being. You can't not-be on a boat."
>
> Rosencrantz: I've frequently not been on boats."
>
> Guildenstern: No, no, no - what you've been is not on boats."(۵)

۸۔فرنانڈوارابال(Fernando Arrabal)

ارابال ایک ہسپانوی ڈرامہ نگار، ناول نگار اور فلم ساز ہے جو تھیٹر آف دی ایبسرڈ سے وابستہ رہا تھا۔ ان کے ڈرامے "The Architect and the Emperor of Assyria" اور " The Grand Ceremonial" خاص طور پر طاقت اور اختیار کی مضحکہ خیزی کی تلاش کے لیے قابل ذکر ہیں۔

۹۔ دانئیل خرمس(Daniil Kharms)

خرمس ایک روسی شاعر اور ڈرامہ نگار تھا جو روسی لایعنیت کی تحریک سے وابستہ رہا ہے۔ ان کے ڈرامے اور کہانیاں جیسے "دی اولڈ وومن" اور "دی بلیو نوٹ بک" زبان اور بات چیت کی مضحکہ خیزی کی تلاش کے لیے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

۱۰۔فلان اوبرائن(Flann O'Brien)

اوبرائن ایک آئرش ناول نگار اور ڈرامہ نگار تھے جو آئرش لایعنیت ت کی تحریک سے وابستہ رہے۔ ان کا ناول "The Third Policeman" اور ان کا ڈرامہ "At Swim-Two-Birds" بیانیہ اور حقیقت کی لایعنیت کی کھوج کے لیے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اردو ادب میں لایعنیت:

ا۔ سعادت حسن منٹو:

سعادت حسن منٹو جدید دور کے نامور ادیبوں میں سے ایک ہیں جنہوں نے لایعنیت کی کھوج کی۔ منٹو اردو ادب کے شاندار مصنف تھے اور وہ بڑے پیمانے پر اردو زبان کے عظیم مصنفین میں شمار کیے جاتے ہیں۔ منٹو کی کہانیوں میں اکثر لایعنیت، تشدد اور معاشرے کے اندھیرے کے موضوعات سے نمٹا جاتا ہے۔ وہ ہندوستان اور پاکستان میں زندگی کی تلخ حقیقت کو اپنی گرفت میں لینے کی صلاحیت کے لیے جانے جاتے تھے اور ان کی کہانیوں میں اکثر ان کی غیر متزلزل ایمانداری اور حقیقت پسندی کی خصوصیت ہوتی ہے۔ منٹو اردو کے ان مشہور ادیبوں میں سے ایک ہیں جنہوں نے لایعنی موضوعات کو بیان کیا۔ منٹو ایک افسانہ نگار اور اسکرین رائٹر تھے اور وہ ہندوستان اور پاکستان میں زندگی کی لایعنیت کو اپنی تحریروں میں بیان کرتے رہے۔

منٹو کی سب سے مشہور کہانیوں میں سے ایک "ٹوبہ ٹیک سنگھ" ہے۔ جس میں ایک ایسے شخص کی کہانی بیان کی گئی ہے جو ۱۹۴۷ کی تقسیم کے دوران ہندوستان اور پاکستان کے درمیان پھنس گیا۔وہ تاریخ کی طاقتوں کے جال میں پھنس گیاہے۔ سعادت حسن منٹو "ٹوبہ ٹیک سنگھ" میں لکھتے ہیں:

> "ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں تھا؟ وہ نہیں جانتا تھا۔ وہ ہندوستان میں تھا یا پاکستان میں؟ وہ بھی نہیں جانتا تھا۔ وہ صرف اتنا جانتا تھا کہ یہ وہ جگہ تھی جسے اس نے جب تک یاد رکھا تھا گھر بلایا تھا۔ اور اب اچانک اس سے کہا جا رہا تھا کہ اسے اسے پیچھے چھوڑنا ہے، یہ ایک مضحکہ خیز بات تھی، اس نے سوچا، وہ کیسے نقشے پر ایک لکیر کھینچ سکتے ہیں اور لوگوں کے حرکت میں آنے کی توقع کیسے کر سکتے ہیں؟ وہ کبھی جانتا تھا؟"(۶)

افسانہ "ٹوبہ ٹیک سنگھ" ایک ذہنی مریض کی کہانی بیان کرتا ہے جو ہندوستان اور پاکستان کی تقسیم کے درمیان میں پھنس گیا تھا۔ کہانی جنگ کی لایعنیت اور سیاسی تنازعہ کی انسانی قیمت کی ایک طاقتور تصویر ہے۔ جیسے مرکزی کردار کہتا ہے کہ

> "ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے؟ وہ نہیں جانتا تھا۔ کیا یہ بھارت میں ہے یا پاکستان میں؟ وہ اس بات کو بھی نہیں جانتا تھا۔ اسے صرف یہ معلوم تھا کہ یہ ایک جگہ تھی جو وہ اپنے گھر کے طور پر سمجھتا تھا۔ اور اب اسے بتایا جا رہا تھا کہ اسے یہ سب پیچھے چھوڑنا ہوگا۔ یہ بے معنی

تھا۔ اس نے سوچا کہ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ صرف ایک نقشہ پر لکیر کھینچ لیں اور لوگ اپنے گھر چھوڑ کر چلے جائیں؟ کیسے انتظار کر سکتے ہیں کہ وہ سب کچھ پیچھے چھوڑ دیں جو انہیں معلوم ہوتا ہے؟"(۷)

۲۔ عصمت چغتائی:

ایک اور اردو مصنفہ جس نے لایعنیت کے موضوعات کو بیان کیا وہ عصمت چغتائی تھیں۔ چغتائی ایک نسائی مصنفہ تھیں جو اپنی جرات مندانہ اور متنازعہ کہانیوں کے لیے مشہور تھیں، جن میں سے اکثر صنفی، جنسیت اور سماجی عدم مساوات کے موضوعات کے متعلق تھیں۔ چغتائی کی کہانیوں میں اکثر غیر روایتی کرداروں اور حالات کو نمایاں کیا جاتا تھا اور وہ سماجی اصولوں اور روایات کو چیلنج کرنے کی صلاحیت کے لیے مشہور تھیں۔ اس کی سب سے مشہور کہانیوں میں سے ایک "Lihaaf" ہے، جو ایک نوجوان لڑکی کی کہانی بیان کرتی ہے جسے اس کی خالہ اور چچا کے ساتھ رہنے کے لیے بھیجا جاتا ہے، اور جسے اس کی خالہ اور عورت کے درمیان ایک خفیہ تعلق کا پتہ چلتا ہے۔ یہ کہانی صنف اور جنسیت کی ایک طاقتور تحقیق ہے، اور اسے اکثر اردو میں حقوق نسواں کے ضمن میں ایک تاریخی کام کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اس میں لایعنیت کے نظریات موجود ہیں۔

۳۔ اختر:

اردو کے ایک اور مصنف جنہوں نے لایعنیت کے موضوعات کو تلاش کیا وہ محمد خالد اختر تھے۔ اختر ایک اچھے افسانہ نگار اور ناول نگار تھے، وہ انسانی رشتوں کی پیچیدگیوں اور روزمرہ کی زندگی کی بے معنویت کو اپنے ناولوں کا موضوع بناتے ہیں۔ اختر کی سب سے مشہور کہانیوں میں سے ایک "آخری آدمی" ہے، جس میں ایک ایسے شخص کی کہانی بیان کی گئی ہے جو موت کے خیال میں مبتلا ہے۔ یہ کہانی شرح اموات اور انسانی حالت کی ایک طاقتور تحقیق ہے اور اسے اکثر اردو ادب کے عظیم ترین کاموں میں سے ایک کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

۴۔احمد ندیم قاسمی:

اردو کے ایک اور مصنف جس نے لایعنیت کے موضوعات کو اپنی تحریروں میں اپنایاوہ احمد ندیم قاسمی تھے۔ قاسمی ایک شاعر، صحافی، اور افسانہ نگار تھے۔ قاسمی کی سب سے مشہور کہانیوں میں سے ایک "گنڈاسا" ہے، جو ایک ایسے شخص کی کہانی بیان کرتی ہے جو ایک روایتی کھیتی باڑی کا جنون بن جاتا ہے جسے "گنڈاسا" کہا جاتا ہے۔ کہانی انسانی خواہش کی مضحکہ خیزی اور ان طریقوں کی ایک طاقتور تحقیق ہے جس سے ہم بظاہر معمولی چیزوں یاخیالات پر ٹھہرے ہوئے ہوسکتے ہیں۔

۵۔انتظار حسین:

اردو کے ایک اور مصنف جس نے لایعنیت کے موضوعات کو تلاش کیاوہ انتظار حسین تھے۔ حسین ایک ناول نگار اور افسانہ نگار تھے اور وہ پاکستان میں روزمرہ کی زندگی کے موضوعات کو اپنی تحریروں میں اپناتے تھے۔ حسین کی سب سے مشہور کہانیوں میں سے ایک "بستی" ہے، جو ایک ایسے شخص کی کہانی بیان کرتی ہے جو اپنے آبائی گاؤں واپس آتا ہے اور اسے پتہ چلتا ہے کہ اسے جدیدیت کی قوتوں نے تبدیل کر دیا ہے۔ یہ کہانی جنوبی ایشیائی معاشرے میں روایت اور جدیدیت کے درمیان تناؤ کی ایک طاقتور تحقیق ہے اور اسے اکثر اردو ادب کی عظیم ترین تخلیقات میں سے ایک کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

۶۔مشتاق احمد یوسفی

اردو کے ایک اور ادیب جنہوں نے لایعنیت کے موضوعات کو تلاش کیاوہ مشتاق احمد یوسفی تھے۔ یوسفی ایک مزاح نگار اور طنز نگار تھے اور وہ پاکستان میں روزمرہ کی زندگی کی مضحکہ خیزی کو پکڑنے کی اپنی صلاحیت کی وجہ سے جانے جاتے تھے۔

مشتاق احمد یوسفی کی "آب گم" کا ایک حوالہ یہ ہے جس میں لایعنیت کے موضوعات کو تلاش کیا گیا ہے:

> "میں نے کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی اور دیکھا کہ سب مجھے گھور رہے ہیں۔
> میں نے سوچا کہ کیا میں نے کچھ غلط کہا ہے اور پھر مجھے احساس ہوا کہ میں نے اپنے جوتے

غلط پیروں میں پہن رکھے تھے۔ یہ مضحکہ خیز تھا، میں نے سوچا۔ اتنی سادہ سی غلطی کی؟
لیکن پھر، زندگی لایعنیت سے بھری ہوئی ہے۔ ہمیں بس ان پر ہنسنا سیکھنا ہے۔"(۸)

یوسفی کی سب سے مشہور تصانیف میں سے ایک "آبِ گم" ہے، جو مزاحیہ مضامین کا ایک مجموعہ ہے جس میں سیاست سے لے کر مذہب تک اور روزمرہ کی زندگی کے نرالے موضوعات تک کو تلاش کیا گیا ہے۔

لایعنیت کے عناصر:

لایعنی تحریروں میں اکثر ایسے کردار ہوتے ہیں جو زندگی اور کائنات کے معنی پر سوال اٹھاتے ہیں اور جو سمجھتے ہیں کہ ان کا وجود بنیادی طور پر بے معنی ہے۔ یہ اکثر اس تھیم کو دریافت کرنے کے لیے مزاح اور ستم ظریفی کا استعمال کرتے ہیں اور یہ مزاحیہ اور المناک دونوں ہو سکتا ہے۔ لایعنیت کے متعلق کامیو کا خیال ہے کہ انسان اس بے معنویت کی حالت میں تین کام کر سکتا ہے:

- خودکشی(suicide)
- روحانی پناہ(philosophical suicide)
- جب انسان معنویت ڈھونڈتا ہے تو اس کے اور زندگی کے درمیان ایک تضاد کی فضا قائم ہوتی ہے۔
- اس بات پر یقین کیا جائے کہ life is absurd اور بنا کسی مقصد کے زندگی گزاری جائے۔
- جب انسان معنویت ڈھونڈتا ہے تو اس کے اور زندگی کے درمیان ایک تضاد کی فضا قائم ہوتی ہے۔

انیس ناگی کے ناولوں میں "لایعنیت" کے اثرات کا جائزہ:

لایعنیت کا آغاز تو بہت پہلے ہی ہو چکا تھا لیکن اس کو البیر کامیو نے اپنے مضمون دی متھ آف سیسیفس میں متعارف کروایا۔ انیس ناگی البیر کامیو سے بہت متاثر تھے انہوں نے ان کے مضمون دی متھ آف سیسیفس کا اردو میں سیسفس کی کہانی کے نام سے ترجمہ کیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے کامیو کے ناول The plague کا طاعون کے نام سے ترجمہ کیا۔

ا۔خودکشی:

لایعنیت میں خودکشی کو اکثر بے معنی اور لغویت کے احساس کے ردعمل کے طور پر دیکھا جاتا ہے جو ایک ایسی دنیا میں رہنے سے پیدا ہو سکتا ہے جو مقصد یا قدر سے خالی نظر آتی ہے۔ لایعنی لوگ دلیل دیتے ہیں کہ انسان ایک ایسی دنیا میں پھنسے ہوئے ہیں جو بنیادی طور پر غیر معقول ہے اور اس میں کوئی حتمی سچائی یا معنی نہیں پایا جا سکتا۔ نتیجے کے طور پر کچھ لایعنیت پسند لوگوں کا خیال ہے کہ خودکشی اس احساس کا ایک منطقی ردعمل ہے کہ زندگی فطری طور پر بے معنی ہے۔ تاہم کچھ لاایعنیت پسند لوگوں کا یہ خیال ہے کہ خودکشی بے معنیویت کے مسئلے کا حل نہیں ہے اور یہ کہ زندگی کی لغویت کا مقابلہ کرنے کا واحد طریقہ اسے اپنانا اور اس کے بعد معنی اور مقصد تلاش کرنا ہے۔ لایعنیت میں خودکشی کا تصور پیچیدہ اور کثیر جہتی ہے اور مختلف مصنفین اور مفکرین نے مختلف طریقوں سے اس کے متعلق گفتگو کی ہے۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ کون سے مفکرین اور تحریر نگار خودکشی کے خلاف ہیں کیونکہ لایعنیت کا فلسفہ مصنفین اور مفکرین کی ایک وسیع رینج پر محیط ہے، جن میں سے ہر ایک اپنے اپنے منفرد نقطہ نظر رکھتا ہے۔ تاہم بعض لایعنیت پسندوں نے یہ کہا ہے کہ خودکشی بے معنویت کے مسئلے کا حل نہیں ہے اور یہ کہ زندگی کی بے معنویت کا مقابلہ کرنے کا واحد راستہ اسے اپنانا اور زندگی کی بے معنویت کے باوجود معنی اور مقصد تلاش کرنا ہے۔ مثال کے طور پر فلسفی البرٹ کامیو نے دلیل دی کہ خودکشی زندگی کا رد ہے اور وجود کی بے معنویت کا مقابلہ کرنے کا واحد طریقہ اس کے خلاف بغاوت اور جدوجہد میں معنی تلاش کرنا ہے۔ اسی طرح فرانز کافکا نے اپنے کام میں لغویت اور بے معنویت کے موضوعات کو تلاش کیا لیکن اس نے ان مسائل کے جواب کے طور پر خودکشی کی وکالت نہیں کی۔ اس بات کا فیصلہ کرنا کہ کون سے لایعنیت پسند لوگ خودکشی کے خلاف ہیں یہ فیصلہ کرنا پیچیدہ اور کثیر الجہتی ہے کیوں کہ مختلف مصنفین اور مفکرین نے مختلف طریقوں سے اس تک رسائی حاصل کی ہے۔ جب کہ خودکشی کے بارے میں لایعنیت میں کوئی ایک فلسفہ نہیں ہے، کچھ لایعنیت پسندوں نے دلیل دی ہے کہ خودکشی بے معنویت اور لغویت کے احساس کا ایک منطقی ردعمل ہے جو ایسی دنیا میں رہنے سے پیدا ہو سکتی ہے جو مقصد یا قدر سے خالی نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر فلسفی Friedrich Nietzsche نے دلیل دی کہ زندگی کی موروثی بے معنییت کا ادراک روایتی اقدار کے انکار اور زندگی میں

اپنے معنی پیدا کرنے کی خواہش کا باعث بن سکتا ہے لیکن یہ مایوسی اور وجود سے مکمل طور پر فرار ہونے کی خواہش کا باعث بھی بن سکتا ہے۔ اسی طرح مصنف سیموئیل بیکٹ نے اپنی تحریروں میں لایعنیت اور مایوسی کے موضوعات کو تلاش کیا اور کچھ ناقدین نے اس بات پر زور دیا ہے کہ اس کے کرداروں کی بے معنی اور مایوسی کے ساتھ جدوجہد ایک وسیع تر لایعنی فلسفے کی عکاسی کرتی ہے جو خودکشی کو وجود کی بے معنویت کے لیے ایک درست رد عمل کے طور پر دیکھتا ہے۔ تاہم یہ بات اہم ہے کہ تمام لایعنی مفکرین بے معنویت کے مسئلے کے حل کے طور پر خودکشی کی وکالت نہیں کرتے ہیں اور بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ زندگی کی موروثی بے معنویت کے باوجود معنی اور مقصد تلاش کرنا ممکن ہے۔

کچھ لایعنیت پسندوں کی تحریروں میں کردار خودکشی کو حل سمجھتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں مثلاً ژاں پال سارتر کا ناول "متلی" وجودی مایوسی اور بے معنویت کے موضوعات کو تلاش کرتا ہے اور اس میں ایک ایسا کردار پیش کیا گیا ہے جو پوری کتاب میں خودکشی کے خیالات کے ساتھ جدوجہد کرتا ہے۔ البرٹ کامیو کا مضمون "سیسیفس کی کہانی" وجود کی لغویت کی ایک فلسفانہ تحقیق ہے اور اس میں زندگی کی بے معنویت کے رد عمل کے طور پر خودکشی کی بحث کو پیش کیا گیا ہے۔ سیموئل بیکٹ کے ڈرامے "اینڈ گیم" میں ایسے کردار دکھائے گئے ہیں جو ایک بے معنی وجود میں پھنسے ہوئے ہیں اور جو خودکشی کو اپنی مایوسی سے نکلنے کا راستہ سمجھتے ہیں۔ اسی طرح فرانز کافکا اکثر لایعنیت اور مایوسی کے موضوعات کو تلاش کرتا ہے اور اس کے ناول "دی ٹرائل" میں ایک ایسے کردار کو دکھایا گیا ہے جسے بغیر کسی وجہ کے موت کی سزا سنائی جاتی ہے۔

جبکہ بہت سے لایعنی مصنفین خودکشی کو بے معنویت کے مسئلے کے حل کے طور پر مسترد کرتے ہیں اور اس کے بجائے زندگی کی موروثی لغویت کے باوجود معنی اور مقصد تلاش کرنے کی وکالت کرتے ہیں۔ کامیو کے ناول "دی سٹرینجر" میں ایک کردار دکھایا گیا ہے جو اس سوال کے ساتھ جدوجہد کرتا ہے کہ آیا زندگی جینے کے قابل ہے، لیکن بالآخر فیصلہ کرتا ہے کہ یہ ہے۔ اسی طرح بیکٹ کے ڈرامے "ویٹنگ فار گوڈوٹ" میں ایسے کردار دکھائے گئے ہیں جو ایک بے معنی وجود میں پھنسے ہوئے ہیں، لیکن وہ کچھ بہتر کی امید کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح اسٹاپپارڈ کا ڈرامہ "روزین کرانٹزاور گلڈنسٹرن آر ڈیڈ" میں ایسے کرداروں کو پیش کیا گیا ہے جو ایک ایسی دنیا میں معنی تلاش کرنے کے لیے جدوجہد کرتے ہیں جو بظاہر بیرونی طاقتوں کے زیر اثر ہے۔

Eugene Ionesco: Ionesco کے ڈرامے "Rhinoceros" میں ایسے کردار دکھائے گئے ہیں جو گینڈے میں تبدیل ہو جاتے ہیں لیکن وہ اپنی صورتحال کی لغویت کے خلاف جدوجہد کرتے رہتے ہیں۔

مختصراً یہ کہ تمام لایعنی مصنفین خودکشی کو بے معنویت کے مسئلے کے حل کے طور پر مسترد نہیں کرتے ہیں اور یہ کہ لایعنی تحریک کے اندر وسیع تناظر موجود ہے۔

ان لایعنیت پسند مصنفین کے کچھ اقتباسات درج ہیں جہاں وہ خودکشی کو بے معنویت کے مسئلے کے حل کے طور پر مسترد کرتے ہیں:

ساتر لکھتا ہے:

"The only way to deal with death is to transform everything that precedes it into art." –(۹)

اسی طرح کامیو دی میتھ آف سیسیفس میں کہتا ہے کہ

"The struggle itself toward the heights is enough to fill a man's heart. One must imagine Sisyphus happy."(۱۰)–

بیکٹ کہتا ہے کہ:

"I can't go on, I'll go on." –(۱۱)

ایک اور جگہ بیکٹ کہتا ہے:

"We are all born mad. Some remain so." –(۱۲)

Eugene Ionesco اسی طرح لکھتا ہے کہ:

"I write to keep from going mad from the contradictions I find among the human beings around me." –(۱۳)

Tom Stoppard نے خودکشی کے متعلق یہ کہا ہے:

"I have no sense of belonging to anything. I'm just floating around in this absurd universe of ours." – (۱۴)

مختصر یہ کہ خود کشی کے معاملے پر "لایعنیت" میں کوئی ایک نقطہ نظر موجود نہیں ہے۔

لایعنیت کے لحاظ سے کامیو کا مضمون دی متھ آف سیسیفس ،بیکٹ کا ویٹنگ فار دی گوڈووٹ، Eugene Ionesco کا دی بالڈ سپر انو اور کامیو کا اجنبی اہمیت کے حامل ہیں۔

انیس ناگی کے ناول دیوار کے پیچھے میں مرکزی کردار زندگی کی بے معنویت کو محسوس کرنے کے بعد خودکشی کرتا ہے لیکن ناکام رہتا ہے۔ جیسا کہ کامیو نے کہا تھا کہ انسان جب اس بات کو قبول کر لے زندگی بے معنی ہے تو وہ سب سے پہلے خود کشی کرتا ہے۔ یہی ناول کے مرکزی کردار کے ساتھ ہوتا ہے وہ زندگی کی بے معنویت کی وجہ سے تنگ آجاتا ہے اور معاشرہ اسے اپنا مقصد تلاش کرنے کی اجازت بھی نہیں دیتا ہے ۔دوسری طرف معاشرتی بے بسی بھی اسے جینے نہیں دیتی ۔یہی وہ صورتِ حال تھی جس نے پروفیسر کو خود کشی کرنے پر مجبور کیا۔

انیس ناگی کے ناول میں اور وہ میں خود کشی کا ذکر نہیں کیا گیا۔ناول کا مرکزی کردار زندگی کو بے معنی سمجھتا ہے اور زندگی کے متعلق تمام نظریات کو بے معنی سمجھتا ہے۔ سیاسی، سماجی اور معاشرتی نظریات کی نفی کرتا ہے۔وہ سمجھتا ہے کہ یہ نظریات انسان کی بقا کے لیے نہیں بلکہ انسان کو قید کرنے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ جس کا مقصد انسان کو بے بس، لاچار اور مفلوج کرنا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار معاشی بے بسی کا شکار ہے۔اس کے معاشی حالات بہت خراب ہیں لیکن وہ پھر بھی دل ہی دل میں وہ جینا چاہتا ہے لیکن معاشرتی اور سیاسی نظام اس کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ ان تمام مسائل اور ادھوری خواہشات کے باوجود وہ خود کشی نہیں کرتا ہے۔

انیس ناگی کے ناول زوال میں مرکزی کردار احسن بھی خود کشی نہیں کرتا ہے۔ ناول کی کہانی احسن کے گرد گھومتی ہے جو ایک مہلک مرض میں مبتلا ہے وہ اس مرض سے جان چھڑوانا چاہتا ہے لیکن وہ کامیاب نہیں ہوتا اور آہستہ آہستہ مرض بڑھتا جاتا ہے اور اسی حساب سے خرچے بھی۔ وہ ایک معمولی آفسر ہے جو سیاسی اور معاشی نظام کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے۔ وہ اس نظام سے فرار چاہتا ہے لیکن بے بس ہے۔ ناول میں

دکھایا گیا ہے کہ احسن موت سے بے حد خوف زدہ ہے اور اسے یہی وسوسے کھائے جا رہے ہیں کہ کہیں وہ بے نام موت مارا نہ جائے۔ احسن ان سب مسائل کے باوجود خودکشی کرنے کے بارے میں نہیں سوچتا۔

۲۔ فلسفانہ / فکری خودکشی:

لایعنیت میں فلسفانہ خودکشی زندگی کی بے معنویت سے بچنے یا انکار کرنے کے عمل کو کہتے ہیں جو کہ ایک اعتقادی نظام یا فلسفہ کو اپنا کر زندگی کے سوالات کا آسان جواب فراہم کرتا ہے۔ اس میں مذہب، سائنسی عقلیت پسندی اور اصول پسندانہ سوچ کی دوسری شکلیں شامل ہو سکتی ہیں جو معنی یا مقصد کا احساس پیش کرتی ہیں۔ لایعنی لوگ دلیل دیتے ہیں کہ ایسے عقائد کو اپنانے سے افراد بنیادی طور پر جھوٹی تسلی کے بدلے اپنی آزادی اور خودمختاری ترک کر کے "خودکشی" کر رہے ہیں۔ اس کے بجائے لایعنیت افراد کو زندگی کی مضحکہ خیزی کو قبول کرنے اور ایک ایسی دنیا میں اپنے معنی پیدا کرنے کی ترغیب دیتی ہے جو فطری طور پر بے معنی ہے۔

البرٹ کامیو وہ فرانسیسی فلسفی اور مصنف ہیں جنہوں نے فلسفانہ خودکشی پر بحث کی۔ کامیو نے اپنے مضمون "دی میتھ آف سیسیفس" میں فلسفانہ خودکشی کے تصور کو پیش کیا۔ جہاں اس نے دلیل دی کہ افراد کو خودکشی کا سہارا لینے یا ایسے عقیدے کے نظام کو اپنانے کے بجائے زندگی کی لغویت کو اپنانا چاہیے۔ دیگر مصنفین جنہوں نے فلسفانہ خودکشی کے تصور پر بحث کی ہے ان میں مارٹن ہائیڈیگر، فریڈرک نطشے اور ژاں پال سارتر شامل ہیں۔

البرٹ کامیو نے اپنے مضمون "The Myth of Sisyphus" میں فلسفیانہ خودکشی کے تصور پر بحث کی ہے جو کوئی ناول نہیں بلکہ ایک فلسفیانہ مضمون ہے۔ مضمون میں کامیو نے دلیل دی ہے کہ افراد کو خودکشی کا سہارا لینے یا ایسے اعتقاد کے نظام کو اپنانے کے بجائے زندگی کی لایعنیت کو اپنانا چاہیے۔ کامیو اس سلسلے میں یونانی دیومالائی کہانی سیسیفس کو انسانی حالت کے استعارے کے طور پر پیش کرتا ہے، جس میں ہمیشہ کے لیے ایک پہاڑی کو اوپر دھکیلنے کی مذمت کی گئی تھی۔ اس کا استدلال ہے کہ سیسیفس کی طرح انسانوں کو اپنی زندگی میں وجود کے موروثی بے معنی ہونے کے باوجود معنی تلاش کرنا چاہیے۔

انیس ناگی کے ناول دیوار کے پیچھے فلسفانہ خود کشی کی مخالفت کی گئی ہے۔ مرکزی کردار پروفیسر کسی بھی فلسفے میں پناہ نہیں لیتا۔ وہ تمام فلسفوں سے انکار کرتا ہے۔ اسے کسی فلسفے پر یقین نہیں۔ وہ زندگی کی بے معنویت کے درمیان الجھا رہتا ہے جس سے اسے کوئی بھی فلسفہ نہیں نکال سکتا۔ ایک جگہ کامیو کے بارے میں کہتا ہے:

"میں احمد کی پیشکش قبول کر لوں یا سڑیوجن کی طرح خود کشی اختیار کر لوں ؟ وہ بے وقوف خدا بننا چاہتا تھا، میں کسی ایسی مابعد الطبیعاتی کے مغالطے کا شکار نہیں ہوں۔ دوسری طرف احمد کا ساتھی بن کر مایوسی کو امید سمجھ کر خود کشی سے گریز کر جاؤں، لیکن یہ کام کامیو کر سکتا ہے۔"(۱۶)

انیس ناگی کے ناول زوال میں بھی فلسفانہ خود کشی کو رد کیا گیا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار کسی بھی فلسفے یا نظریے کی بنا پر زندگی نہیں گزارنا چاہتا۔ وہ خود زندگی کو معنی دینا چاہتا ہے وہ کسی بھی نظریے کا حامی نہیں۔ وہ ان سب کو بے معنی سمجھتا ہے۔

زوال میں بھی احسن فلسفانہ خود کشی نہیں کرتا ہے۔ وہ بھی کسی نظریے کی پناہ میں نہیں آنا چاہتا۔ وہ کسی نظریے کا پرچار نہیں کرتا البتہ اس کا ایک دوست ماجد مارکسیت کا قائل ہے۔

۳۔ زندگی کی بے معنویت

البیر کامیو کے "دی سٹرینجر" میں مرکزی کردار مرسو کو زندگی میں معنی اور مقصد کے بحران کا سامنا ہے۔ اپنی ماں کی موت کے بعد، مرسو جذباتی طور پر اپنے ارد گرد کی دنیا سے الگ ہو جاتا ہے اور انسانی وجود کی قدر پر سوال اٹھانا شروع کر دیتا ہے۔ اس کی عکاسی پورے ناول میں ان کے خیالات اور عمل سے ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر جب اس سے پوچھا گیا کہ وہ اپنی ماں کے جنازے پر کیوں نہیں رویا تو مرسو نے جواب دیا:

"I don't know. I thought about it quite a bit afterward. All in all, it was probably because I had nothing to cry about. Anyway, I tried to change the subject. But he kept on asking me why I didn't cry. So I told him."(۱۷)

مرسو کی دنیا سے لاتعلقی اور زندگی میں معنی تلاش کرنے میں ناکامی اسے تشدد کے ایک فعل کا ارتکاب کرنے پر مجبور کرتی ہے، جس کا نتیجہ بالآخر اسے پھانسی کی صورت میں نکلتا ہے۔ ناول کو ایک ایسی دنیا

میں معنی اور مقصد کے لیے انسانی تلاش کی تنقید کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے جو فطری طور پر بے معنی ہے۔ سیموئل بیکٹ کی "وِیٹنگ فار گوڈوٹ" میں دو مرکزی کردار، ولادیمیر اور ایسٹراگون، گوڈوٹ نامی ایک کردار کا انتظار کر رہے ہیں جو کبھی نہیں آتا۔ یہ ڈرامہ زندگی میں معنی اور مقصد کی انسانی تلاش پر ایک تبصرہ ہے کیونکہ کردار انتظار کے باوجود ان چیزوں کو تلاش کرنے سے قاصر ہیں۔ یہ ولادیمیر اور ایسٹراگون کے درمیان درج ذیل مکالمے سے ظاہر ہوتا ہے:

VLADIMIR: We're waiting for Godot.

ESTRAGON: Ah! (Silence.) You're sure it was here?

VLADIMIR: What?

ESTRAGON: That we were to wait.

VLADIMIR: He said by the tree. (They look at the tree.) Do you see any others?

ESTRAGON: What is it?

VLADIMIR: I don't know. A willow.

ESTRAGON: Where are the leaves?

VLADIMIR: It must be dead. (Pause.) No more weeping.

ESTRAGON: Or perhaps it's not the season. (Pause.) Looks to me more like a bush.

VLADIMIR: A shrub.

ESTRAGON: A bush.

VLADIMIR: A—(he hesitates)—so-called tree. (Silence.) What are we doing here, that is the question. (Act I)(۱۸)

اس ڈرامے کو انسانی حالت پر ایک تبصرہ کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے کیونکہ کردار ایک ایسی دنیا میں معنی یا مقصد تلاش کرنے سے قاصر ہیں جو فطری طور پر بے معنی ہے۔

انیس ناگی کے ناول دیوار کے پیچھے میں زندگی کی بے معنویت کے متعلق بحث کی گئی ہے۔ ناول کا مرکزی کردار پروفیسر ناول میں ہر موڑ پر زندگی کی بے معنویت کے متعلق بات کرتا ہے۔ اسے زندگی بے معنی لگتی ہے اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ یہاں انسان کا کوئی مقصد نہیں۔ یہ رشتے، اخلاقی روایات اور سیاسی نظام سب بے معنی ہے۔ انسان تنہا آیا اور تنہا ہی چلا جائے گا یہ سب کچھ بس اس کے استحصال کے لیے موجود ہیں۔ وہ اس سب اکتا جاتا ہے اسی لیے وہ خودکشی کرتا ہے۔ ایک جگہ پروفیسر کہتا ہے:

"زندگی یا موت میں نے چیخ کر کہا، آواز آئی: کچھ نہیں، میں نے کہا میں اس طرح پیچھے نہیں ہٹوں گا"۔ (۱۹)

اس اقتباس سے واضح ہو رہا ہے کہ پروفیسر زندگی کو کتنا بے معنی سمجھتا ہے۔

میں اور وہ میں بھی زندگی کی بے معنویت کے متعلق بات کی گئی ہے۔ ناول کا مرکزی کرادر زندگی کو بے معنی سمجھتا ہے وہ زندگی کی مقصدیت سے انکار کرتے ہوئے دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ کہتا ہے:

"زندگی ایک نہ ختم ہونے والا کھیل ہے۔ جنہیں اس پر اعتماد ہے اور جو باحوصلہ ہیں وہ ناممکن کی طرف نکل جاتے ہیں"۔ (۲۰)

ایک اور جگہ مرکزی کردار کہتا ہے:

"لیکن کیا زندگی ضروری ہے؟ ایک ہی طرح کے صبح و شام، ایک ہی طرح کے معمولات ،ایک ہی طرح کے محدود ذرائع اور وسائل میں سسکنا اور پھر کہنا شکر ہے، یہ بھی زندگی ہے۔"(۲۱)

اسی طرح ایک اور جگہ ناول میں زندگی کی معنویت کے بارے میں کہا گیا ہے:

"مجھے اس زندگی کے لیے اپنا اور اس عہد کا بوجھ اٹھانا ہے، صبح شام ایک ہی کام کرنا ہے اور اس کے علاوہ کر بھی کیا سکتا ہوں۔ یہ سب کچھ بے لذتی ہے۔"(۲۲)

زوال میں بھی زندگی کی بے معنویت کے بارے میں بات کی گئی ہے۔ ناول کا مرکزی کردار احسن کو اپنی زندگی کے ہر موڑ پر زندگی کی بے معنویت کا احسان ہوتا ہے۔ مثلاً ناول کے آغاز میں کہتا ہے:

"یہ سب کچھ اجنبی ہے، بے معنی ہے۔ میرا یہاں جاننے والا کوئی نہیں۔۔۔۔۔۔"(۲۳)

۴۔تضاد

لایعنیت کے مطابق جب ایک انسان اپنی زندگی میں معنویت اور مقصدیت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے توانسان کی اس خواہش اور وجود کی موروثی بے معنویت اور لایعنیت کے درمیان کشیدگی سے تضادconflict کی فضا پیدا ہوتی ہے۔لایعنی مفکرین کا کہنا ہے کہ اس تنازعہ کو روایتی طریقے سے حل نہیں کیا جاسکتا، جیسے کہ مذہب یا دلیل وغیرہ کے ذریعے۔ لٰہذا انسان کو زندگی کی لغویت کو قبول کرنا چاہیے اور ایک ایسی دنیا میں اپنا مطلب ڈھونڈنا چاہیے جو فطری طور پر بے معنی ہے اور یہ طرزِ عمل معاشرتی اصولوں کے ساتھ تصادم کا باعث بن سکتا ہے کیونکہ وہ انسان جو روایتی عقائد کے نظام اور طرز زندگی کو مسترد کرتے ہیں انہیں بیرونی جاسوس یا باغی انسان کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔مزید یہ کہ انسان اور وجود کی لغویت کے درمیان تصادم اضطراب، مایوسی اور بیگانگی کے جذبات کا باعث بن سکتا ہے۔ مثلاً کامیو کے ناول اجنبی میں جب مرکزی کردار مرسو اپنی زندگی میں معنی تلاش کرتا ہے اور اس کے مطابق زندگی گزارنا چاہتا ہے توزندگی کی موروثی بے معنویت اس کے اور معاشرے کے درمیان تضاد کی فضا پیدا ہوتی ہے۔اسی طرح یہ تضاد ہمیں بیکٹ اور کافکا کے ناولوں میں بھی دکھائی دیتا ہے۔

قرۃ العین حیدر کا ناول "آگ کا دریا" کئی صدیوں پر محیط ہے اور مختلف کرداروں کی زندگیوں کی پیروی کرتا ہے جو سبھی اپنی زندگی میں معنی تلاش کرنے کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ناول میں تنازعات کی سب سے نمایاں مثالوں میں سے ایک برطانوی استعمار اور ہندوستانی آزادی پسندوں کے درمیان جدوجہد ہے۔ نو آبادکاروں کو یقین ہے کہ وہ ہندوستان میں تہذیب اور ترقی لا رہے ہیں، جب کہ آزادی پسندوں کو بھی اتنا ہی یقین ہے کہ انہیں ہر قیمت پر نو آبادیات کے خلاف مزاحمت کرنی چاہیے۔یہ تنازعہ بالآخر تشدد اور خونریزی کا باعث بنتا ہے لیکن کوئی بھی فریق فیصلہ کن فتح حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوتا۔"بستی" یہ ناول انتظار حسین کے سب سے مشہور ناولوں میں سے ایک ہے اور اس میں شناخت، یادداشت اور نقصان کے موضوعات کو تلاش کیا گیا ہے۔یہ ناول ہندوستان اور پاکستان کی تقسیم کے پس منظر میں ترتیب دیا گیا ہے اور ذاکر نامی ایک شخص کی زندگی کی پیروی کرتا ہے جو اپنے ملک میں رونما ہونے والی تبدیلیوں سے نمٹنے کے لیے جدوجہد کر رہا ہے۔ روایت اور جدیدیت کے درمیان کشمکش ناول کا ایک نمایاں موضوع ہے ۔۲. " A

"Chronicle of the Peacocks"(انتظار حسین) یہ مختصر کہانیوں کا مجموعہ ہے جو پاکستان میں رہنے والے مختلف کرداروں کی زندگیوں کو تلاش کرتا ہے۔ کہانیاں ملکی تاریخ کے پس منظر میں ترتیب دی گئی ہیں، روایت اور جدیدیت کے درمیان تصادم پورے مجموعے میں بار بار دکھائی دیتا ہے۔

دیوار کے کے پیچھے میں پروفیسر اور معاشرے کے درمیان تضاد کی فضا بار بار جنم لیتی ہے۔ پروفیسر جینا چاہتا ہے لیکن معاشرہ اسے جینے نہیں دیتا ہے۔ وہ اخلاقی روایات کو رد کرنا چاہتا ہے لیکن معاشرتی اصول بیچ میں آجاتے ہیں۔ وہ سیاسی نظریات کو رد کرنا چاہتا ہے لیکن سیاسی نظام اسے اس چیز کی اجازت نہیں دیتا۔ وہ مرنا چاہتا ہے اسی لیے خودکشی کرتا ہے لیکن موت بھی اسے قبول نہیں کرتی۔ پروفیسر ہمیں بے بس اور لاچار دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ کہتا ہے:

"ایک چھوٹی کائنات اور ایک بڑی کائنات، تصادم، کیا یہ ممکن ہے کہ چھوٹی اور بڑی کائنات کو ہلاکو کی طرح ظالمانہ طریقے سے فتح کیا جاسکے؟"(۲۴)

چھوٹی کائنات اس کے وجود میں موجود کائنات ہے جس میں بہت سی خواہشات جنم لیتی ہیں جبکہ بڑی کائنات یہ معاشرہ ہے جن کے درمیان تضاد پیدا ہوتا ہے۔

انیس ناگی کے ناول میں اور وہ میں بھی مرکزی کردار اور معاشرے کے درمیان تضاد دکھائی دیتا ہے۔ جب بھی مرکزی کردار اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزارنا چاہتا ہے تو اس کے اور معاشرے کے درمیان تضاد کی فضا قائم ہو جاتی ہے۔ مثلاً:

"یار تم بڑے گہرے آدمی ہو۔ تمہاری دراز میں بڑی گڑبڑ قسم کی کتابیں ہیں، تمہیں کس ازم سے دلچسپی ہے؟

ہیومنزم سے ہاہاہا چھپاتے کیوں ہو؟ امجد نے جملہ کسا۔۔۔۔۔۔۔۔۔: چھپانے کی کیا بات ہے، کتابیں پڑھنا جرم نہیں، سوچنا منع ہے، چھوڑو یار کس بحث میں الجھ گئے ہو، رفیق کی مداخلت کی۔"(۲۵)

زوال میں بھی مرکزی کردار احسن اور معاشرے کے درمیان تضاد کی فضا قائم دکھائی دیتی ہے وہ بھی ایک سرکاری افسر ہے جو اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتا ہے لیکن معاشرہ اسے اس کا حق نہیں دیتا۔ وہ گرہستی سے تنگ ہے لیکن اسے بھی نہیں چھوڑ سکتا۔

۵۔بے ربط پلاٹ:

لایعنیت میں "بے ربط پلاٹ" کا استعمال کسی ایسی کہانی کو بیان کرنے کے لیے کیا جاتا ہے جسے ناول نگار جان بوجھ کر غیر منطقی، غیر معقول اور بے ربط رکھنا چاہتا ہو۔ پلاٹ میں اکثر بیانیہ کی واضح ساخت کا فقدان ہوتا ہے اور کردار عجیب و غریب یا ناقابل فہم طریقوں سے برتاؤ کرتے ہیں۔ بے ربط پلاٹ کا مقصد سامعین کی توقعات کو چیلنج کرنا اور کہانی سنانے کے روایتی انداز سے انحراف کرنا ہوتا ہے۔ مثلاً سیموئیل بیکٹ کا "وٹینگ فار گوڈوٹ" یہ ڈرامہ شاید لایعنیت میں ایک بے ربط پلاٹ کی سب سے اہم مثال ہے۔ یہ ڈرامہ دو کرداروں کے گرد گھومتا ہے، ولادیمیر اور ایسٹراگون، جب وہ گوڈوٹ نامی کردار کی آمد کا انتظار کرتے ہیں۔ پلاٹ بے ربط ہے اور کردار بے معنی گفتگو اور سرگرمیوں میں مشغول رہتے ہیں۔ ڈرامہ سامعین کی توقعات کو چیلنج کرتا ہے کہ ڈرامہ کیسا ہونا چاہیے اور یہ ڈرامہ انسانی حالت کا بہترین عکاس ہے۔ Tom Stoppard کا تحریر کردہ ڈرامہ "Rosencrantz and Guildenstern Are Dead" اس حوالے سے بہت اہم ہے۔ یہ ڈرامہ شیکسپیئر کے "Hamlet" کو دو معمولی کرداروں Rosencrantz اور Guildenstern کے تناظر میں دوبارہ بیان کرتا ہے۔ یہ ڈرامہ اپنے بے ربط پلاٹ اور سیاہ مزاح کے لیے جانا جاتا ہے اور یہ ناظرین کی توقعات کو چیلنج کرتا ہے کہ ڈرامہ کیسا ہونا چاہیے۔ کردار عجیب و غریب گفتگو اور سرگرمیوں میں مشغول ہیں اور پلاٹ جان بوجھ کر الجھایا گیا ہے۔ یوجین آئونیسکو کا تحریر کردہ ڈرامہ "دی بالڈ سوپرانو" کا پلاٹ بھی بے ربط دکھائی دیتا ہے۔ یہ ڈرامہ تھیٹر آف دی ابسرڈ کی ایک بہترین مثال ہے اور اس میں ایک بے ربط پلاٹ پیش کیا گیا ہے جو جان بوجھ کر مبہم اور غیر منطقی ہے۔ یہ ڈرامہ اسمتھز کی پیروی کرتا ہے، اس کی کہانی ایک متوسط طبقے کے انگریز جوڑے کے گرد گھومتی ہے۔ اس میں اکثر کردار بے معنی گفتگو کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ ڈرامہ بے معنی مکالموں کے استعمال کے لیے جانا جاتا ہے۔ یوجین آئونیسکو کا ڈرامہ دی چیئرز ایک بزرگ جوڑے کے گرد گھومتا ہے جو ایک اہم مہمان کے لیے تیاری کر رہے ہیں، جسے "دی اوریٹر" کہا جاتا ہے۔ یہ جوڑا مہمانوں کے لیے بڑی تعداد میں کرسیاں لگاتا ہے لیکن پورے ڈرامے میں کرسیاں خالی رہتی ہیں۔ یہ ڈرامہ اپنے بے معنی مکالموں کے استعمال کی وجہ سے جانا جاتا ہے۔

ایڈورڈ البی کا ڈرامہ "دی زو اسٹوری" کا پلاٹ بے ربط ہے جو سامعین کی توقعات کو چیلنج کرتا ہے۔ یہ ڈرامہ دو کرداروں پیٹر اور جیری کے متعلق ہے۔ وہ سینٹرل پارک میں ایک عجیب و غریب گفتگو میں مشغول ہوتے ہیں۔ یہ ڈرامہ اپنے سیاہ مزاح اور غیر روایتی تکنیکوں کے استعمال کے لیے جانا جاتا ہے۔ یوجین آئونیسکو کا تحریر کردہ ڈرامہ کی لیسن بھی اس حوالے سے اہم ہے۔ اس ڈرامے میں ایک پروفیسر ایک نوجوان طالب علم کو درس دے رہا ہوتا ہے اور اسی دوران وہ بے ربط مکالمے اور غیر منطقی گفتگو کرتا ہے۔

لایعنیت میں ایک بے ربط پلاٹ روایتی پلاٹ کو چیلنج کرنے اور سامعین کی توقعات کو پامال کرنے کی دانستہ کوشش ہے۔ ان تحریروں میں اکثر غیر منطقی اور غیر معقول پلاٹ ہوتے ہیں اور وہ سامعین کو چیلنج کرتے ہیں کہ وہ کہانی سنانے کی نوعیت اور انسانی حالت کے بارے میں سوچیں۔

انیس ناگی کے ناول دیوار کے پیچھے کا پلاٹ بے ربط دکھائی دیتا ہے۔ ناول میں ایک ترتیب نہیں ہے۔ کبھی ایک منظر بیان کیا جا رہا ہوتا ہے تو کبھی دوسرا منظر۔ کبھی پروفیسر اپنے کمرے موجود ہوتا ہے تو کبھی جھوٹی گواہی دے رہا ہوتا ہے۔ اکثر قاری الجھ جاتا ہے کہ اصل کہانی کیا ہے اور یہی شاید ناگی کا مقصد ہے کہ قاری اپنے ذہن پر زور ڈالے اور ان حالات و واقعات کو سمجھے جن سے اس وقت لوگ گزر رہے تھے۔ اکثر ایسی تحریریں جن میں لایعنیت کے نظریات ہوں ان میں یہ تکنینک استعمال کی جاتی ہیں۔ میں اور وہ کا پلاٹ بھی بے ربط دکھائی دیتا ہے۔ ناول کے آغاز سے اختتام تک قاری الجھا رہتا ہے۔ ناول کے آغاز میں مرکزی کردار اپنی سوچوں میں گم ہوتا ہے کہ اچانک ائیر پورٹ کا منظر بیان کیا جانے لگتے ہے پھر اچانک دفتر کا منظر آ جاتا ہے تو کبھی الجزائر کے لمحات بیان کیے جاتے ہیں۔ ناول میں بہت زیادہ ایسے مناظر آتے ہیں جس سے قاری کو پلات بے ربط دکھائی دیتا ہے۔ زوال کا پلاٹ اتنا زیادہ بے ربط نہیں لیکن چند مقام ایسے ہیں جہاں پلاٹ بے ربط ہو جاتا ہے۔

۶۔ بے معنی مکالمے:

ایسی تحریریں جن میں لایعنی نظریات موجود ہوں تو ان کو لکھنے والے ان میں بے معنی مکالموں کا استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً کامیو کی اکثر تحریروں میں بے معنی مکالمات دکھائی دیتے ہیں اسی طرح سیمیوئل بیکٹ کی تحریروں میں بھی بے معنی مکالمے دکھائی دیتے ہیں۔ بے معنی مکالمے لایعنی تحریروں کے لیے اہم

سمجھے جاتے ہیں۔ لایعنیت کے نظریات پر مشتمل تحریریں بے معنی مکالموں کے حوالے سے مشہور ہیں ۔منتخب کردہ تینوں ناولوں میں بے معنی مکالمے نہیں دکھائی دیتے ہیں۔

۷۔سیاہ مزاح:

لایعنی ادب میں سیاہ مزاح ایک عام عنصر ہے۔ یہ مزاح کی ایک قسم ہے جو سنجیدہ یا ممنوع مضامین سے اس طرح نمٹتی ہے جسے اکثر نامناسب یا ناگوار سمجھا جاتا ہے۔لایعنی مصنفین زندگی کی بے معنویت اور انسانی حالت کو اجاگر کرنے کے لیے سیاہ مزاح کا استعمال کرتے ہیں۔ سنجیدہ موضوعات پر روشنی ڈال کر یہ مصنفین سامعین کی توقعات کو چیلنج کرتے ہیں اور انہیں مزاح، کہانی سنانے اور انسانی تجربے کی نوعیت کے بارے میں سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ سیاہ مزاح کو جوزف ہیلر کے "کیچ ۲۲" اور کرٹ وونیگٹ کے "سلاٹر ہاؤس فائیو" جیسے کاموں میں پایا جاسکتا ہے۔لایعنی ادب میں سیاہ مزاح کی عمدہ مثال جوزف ہیلر کا "کیچ ۲۲" ہے یہ ناول دوسری جنگ عظیم کے دوران لکھا گیا ہے اور کیپٹن جان یوساریان کی کہانی کی پیروی کرتا ہے۔ یہ ناول اپنے سیاہ مزاح اور اس کے موضوعات جیسے جنگ کی بے مقصدیت اور نوکرشاہی کی نوعیت کے لیے جانا جاتا ہے۔ کرٹ وونیگٹ کا "سلاٹر ہاؤس فائیو" ایک سائنس فکشن ہے جس میں جنگ کی مخالفت کی گئی ہے۔ یہ ناول بلی پیلگرم کی کہانی کی پیروی کرتا ہے جب وہ "وقت میں پھنس جاتا ہے" اور اپنی زندگی کے مختلف لمحات سے گزرتا ہے۔ یہ ناول اپنے سیاہ مزاح اور اس کے موضوعات جیسے وقت کی نوعیت اور انسانی حالت کی تلاش کے لیے جانا جاتا ہے۔اسی طرح گنٹر گراس کا "دی ٹن ڈرم" یہ ناول نازی جرمنی میں لکھا گیا ہے اور اس میں آسکر نامی لڑکے کی کہانی ہے جو بڑا ہونے سے انکار کرتا ہے۔ یہ ناول بھی سیاہ مزاح کی عمدہ مثال ہے۔

ان تحریروں میں زندگی کی لایعنیت اور انسانی حالت کو اجاگر کرنے کے لیے سیاہ مزاح کا استعمال کیا گیا ہے۔ سنجیدہ موضوعات پر روشنی ڈال کر یہ مصنفین سامعین کی توقعات کو چیلنج کرتے ہیں اور انہیں مزاح، کہانی سنانے اور انسانی تجربے کی نوعیت کے بارے میں سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ایسی تحریریں مزاحیہ اور المناک دونوں ہو سکتی ہیں کیونکہ یہ اکثر انسانی حالت کو اس طرح دریافت کرتا ہے جو مزاحیہ اور پُرجوش دونوں ہوتے ہیں۔ مزاح ان حالات کی لغویت سے آتا ہے جن میں کردار خود کو پاتے ہیں جبکہ المیہ اس احساس سے آتا ہے کہ ان کا وجود بالآخر بے معنی ہے۔

منتخب کردہ تینوں ناولوں میں سیاہ مزاح کا عنصر موجود نہیں ہے۔ سیاہ مزاح عام طور پر ان موضوعات کے بارے میں بیان لے لیے استعمال کیا جاتا ہے جس کے بارے میں بات کرنا گناہ سمجھا جاتا ہے ۔ اکثر ایسے موضوعات کو سیاہ مزاح کی مدد سے بیان کیا جاتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ Bloomsbury ،philosophy in a meaningless life ،James tartaglia publishing house,2016,p 60

۲۔ Edited by nahum N ،the complete stories ،Franz kafka 1971,pg4،SCHOCkEN books new York ،.GLAZER

۳۔ Bloomsbury ،philosophy in a meaningless life ،James tartaglia publishing house ,2016 ,pg 51

۴۔ ،the myth of Sisyphus and other essays ،Albert camus ,pg 10 1942،translated by justin o brien

۵۔ Bloomsbury ،philosophy in a meaningless life ،James tartaglia. ,2016 , pg 33،publishing house

۶۔ vintage book new York, 1961 ،the theatre of absurd ،Martin eslin , pg 42

۷۔ ایضاً ، ۵۳

۸۔ منٹو ، www. Rekhta.com ، ۱۲/ستمبر ۲۰۲۳ء، بہ وقت دن ۳ بجے

۹۔ ایضاً

۱۰۔ اشفاق احمد ، آب گم ، مکتبہ دانیال ، ۱۹۹۰، ص ۳۴

۱۱۔ vintage book new York, 1961, ،the theatre of absurd ، Martin eslin pg 45

۱۲۔ ایضاً ص ۳۴

۱۳۔ ایضاً ص ۳۵

۱۴۔ ایضاً ص ۳۷

۱۵۔ ایضاً ص ۳۹

۱۶۔ انیس ناگی، دیوار کے پیچھے، زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور، ۱۹۸۳، ص ۶۰

۱۷۔ James tartaglia، philosophy in a meaningless life، Bloomsbury publishing house ,2016,pg 33

۱۸۔ انیس ناگی، دیوار کے پیچھے، زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور، ۱۹۸۳، ص ۶۶

۱۹۔ ایضاً ص ۴۰

۲۰۔ انیس ناگی، میں اور وہ، عالمین پبلشرز پریس، لاہور، ۱۹۸۴ ص ۱۸

۲۱۔ ایضاً ص ۲۱

۲۲۔ ایضاً ص ۳۵

۲۳۔ انیس ناگی، زوال، فیروز سنز پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۹، ص ۴۵

۲۴۔ انیس ناگی، دیوار کے پیچھے، زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور، ۱۹۸۳، ص ۷۷

۲۵۔ انیس ناگی، میں اور وہ، عالمین پبلشرز پریس، لاہور، ۱۹۸۴ ص ۱۲

۲۶۔ ایضاً، ص ۲۸

۲۷۔ ایضاً، ص ۳۹

باب چہارم:

ماحاصل

مجموعی جائزہ:

عدمیت اور لایعنیت کا انیس ناگی کے ناول دیوار کے پیچھے، میں اور وہ اور زوال پر اطلاق کیا گیا ہے۔ اس تحقیقی مقالے کا پہلا باب بنیادی مباحث ہے۔ مقالے میں جو پہلی تھیوری منتخب کی گئی ہے وہ عدمیت ہے۔ اردو ادب میں لفظ "عدمیت" انگریزی اصطلاح Nihilism کے متبادل کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ نہلزم کا لفظ "لاطینی" لفظ "نہل" سے نکلا ہے۔ جس کے معنی "Nothing at all" کے ہیں۔ عدمیت ایک فلسفانہ نظریہ ہے۔ جس کی بنیاد ایک لفظ nothing پر ہے۔ ادب میں عدمیت سے مراد وہ رویہ ہے جو مذہبی، سیاسی ، سماجی اور وجود کے انکار پر مبنی ہے۔عدمیت اصل میں اخلاقی، مذہبی اور علمی شکوک و شبہات کا ایک فلسفہ ہے۔ یوں تو اس کا آغاز نطشے نے death of god کے نعرے سے کر دیا تھا لیکن اس کا باقائدہ آغاز N.I Nadezhdin نے اپنے مضمون سے کیا اور باقاعدہ ایک فلسفانہ تھیوری کے طور پر IvanTurgenev نے اپنے ناول father and sons میں اسے متعارف کروایا۔ عدمیت کی بنیادی اقسام یہ ہیں: علمی عدمیت، مابعد الطبیعاتی عدمیت، سیاسی عدمیت، اخلاقی عدمیت اور سیاسی عدمیت۔ علمی عدمیت فلسفیانہ شکوک و شبہات کی ایک شکل ہے جس کے مطابق علم کا کوئی وجود نہیں ہے یا اگر یہ موجود ہے تو یہ انسانوں کے لیے ناقابلِ حصول ہے۔ مابعد الطبیعاتی عدمیت ایک فلسفیانہ نظریہ ہے کہ شاید کوئی بھی چیز نہ ہو—یعنی کہ ایک ممکنہ دنیا ہے جس میں کوئی بھی چیز نہیں ہے۔ سیاسی عدمیت کے مطابق اانسان کی زندگی میں کوئی بھی سیاسی اہداف نہیں ہوتے ہیں، سوائے تمام موجودہ سیاسی اداروں کی مکمل تباہی کے۔ وجودی عدمیت ایک فلسفیانہ نظریہ ہے جس کے مطابق زندگی کا کوئی باطنی معنی یا قدر نہیں ہے۔ کائنات کے حوالے سے وجودی عدمیت یہ بتاتی ہے کہ ایک انسان یا حتیٰ کہ تمام انسان غیر اہم ہے۔ اخلاقی عدمیت ایک ایسا نظریہ ہے جس کی نظر میں اخلاقی دعوے عام طور پر غلط ہوتے ہیں۔ اس کا خیال ہے کہ کوئی معروضی اخلاقی حقائق یا سچی تجویزیں نہیں ہوتی ہیں۔ نطشے نے ابتدائی بدھ مت کے نظریات کو "غیر فعال عدمیت" کی ایک شکل کے طور پر سمجھا۔ انہوں

نے "روح کی طاقت کے زوال" کا اشارہ دیا۔ عدمیت کے متعلق بہت سے مفکرین نے نظریات پیش کیے جن میں Nadezhdin،IvanTurgenev،Mikhail nikiforovichkatkov ، نطشے، اور N.G Chernyshevsky شامل ہیں۔ اس تحقیقی مقالے میں عدمیت کی تین اقسام کو منتخب کیا گیا ہے جن میں سیاسی عدمیت، اخلاقی عدمیت اور وجودی عدمیت شامل ہیں۔ یوں تو بہت سے مفکرین نے ان کے متعلق نظریات پیش کیے ہیں لیکن nolen gertz کی کتاب نہلزم میں موجود مباحث کو اس حوالے سے مدِ نظر رکھا گیا۔

اس مقالے میں جو دوسری تھیوری منتخب کی گئی ہے وہ لایعنیت ہے۔ اردو ادب میں لفظ "لایعنیت" انگریزی اصطلاح Absurdism کے متبادل کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ Absurdism کا لفظ "لاطینی" لفظ "ابسرڈ" سے نکلا ہے۔ جس کے معنی "مضحکہ خیز، غیر معمولی اور غیر حقیقی" کے ہیں۔ لایعنیت ایک فلسفیانہ نظریہ ہے جس کے مطابق کائنات میں معنی یا عقلی وضاحت تلاش کرنے کی کوششیں بالآخر ناکام ہو جاتی ہیں۔ اور یہ کوششیں مضحکہ خیز ہیں کیونکہ کم از کم انسانوں کے لیے ایسا کوئی معنی موجود ہی نہیں ہے۔ لایعنیت کے متعلق سب سے پہلے انیسویں صدی میں "سورن کرکیگارڈ" نے قلم اٹھایا۔ سورن نے اپنی کتاب "Fear and Trembling" اور "The sickness unto death" میں لایعنیت کے بنیادی مباحث کا آغاز کیا۔ اس کے بعد سب سے اہم نام کامیو کا ہے۔ کامیو نے "دی میتھ آف سیسیفس" (۱۹۴۲) میں لکھا اور اس میں لایعنیت کو بیان کیا۔ البرٹ کامیو نے وجودیت سے لاتعلقی کے بعد "دی میتھ آف سیسی فس" کے نام سے مضمون شائع کیا۔ جس میں انہوں نے کہا کہ انسان اس بے معنویت کی حالت میں تین کام کر سکتا ہے:

- خودکشی (suicide)
- روحانی پناہ (philosophical suicide)
- اس بات پر یقین کیا جائے کہ life is absurd اور بنا کسی مقصد کے زندگی گزاری جائے۔
- جب انسان معنویت ڈھونڈتا ہے تو اس کے اور زندگی کے درمیان ایک تضاد کی فضا قائم ہوتی ہے۔

لایعنیت کی باقائدہ اصطلاح کا استعمال سب سے پہلے مارٹن اسلینmartin esslin " "نے اپنے مضمون " "theatre of the Absurd" میں کیا۔ یہ مضمون ۱۹۶۰ میں لکھا گیا۔ مارٹن نے چند منتخب کردہ ڈراموں کو" Absurd "کے نظریے کے تحت دیکھنے کی کوشش کی۔ بالکل اسی طرح جیسے کامیو نے بیان کیا تھا ۔"تھیٹر آف ابسرڈ "کا نظریہ وجودیت کی تھیوری کے زیرِ اثر منظرِ عام پر آیا۔ "تھیٹر آف آبسرڈ"نے حقیقی اور غیر حقیقی دنیا کو ایک ساتھ دیکھنے کی کوشش کی۔ لایعنیت کے ضمن میں اس تحقیقی مقالے کے لیے مارٹن اسلین کی کتاب "Theatre of the Absurd"اور کامیو کی کتاب دی متھ آف سیسیفس کو مدِ نظر رکھا گیا ہے۔ لایعنیت کے عناصر یہ ہیں: خودکشی، فلسفانہ خودکشی، تضاد، سیاہ مزاح، بے معنی جملے اور بے تکا پلاٹ۔

تقسیمِ ہند کے بعد پاکستانی عوام انفرادی آزادی، اپنے حیاتیاتی وجود اور نئی شناخت کے حوالے سے ذہنی کشمکش کا شکار تھی چنانچہ اس تمام صورتِ حال کو اردو ادب کے لکھنے والوں نے بہت شدت سے محسوس کیا نہ صرف شدت سے محسوس کیا بلکہ اپنی تحریروں کا حصہ بھی بنایا۔ جن میں انور سجاد، انتظار حسین، عزیز احمد، فہیم اعظمی اور انیس ناگی کے نام شامل ہیں۔ انہی لکھنے والوں میں سے انیس ناگی کا نام قابلِ ذکر ہے۔ انیس ناگی نے اپنی تحریروں میں اپنے دور کے حالات کو بہترین انداز میں پیش کیا ہے۔ انیس ناگی نے نہ صرف فرانسیسی ادب کا عمیق مطالعہ کیا بلکہ پابلو نرودا اور البرٹ کامیو جیسے بہترین فرانسیسی لکھاریوں کی تحریروں کا ترجمہ بھی کیا ۔انیس ناگی فرانسیسی ادب سے بہت متاثر تھے۔ انہوں نے کامیو کی کتاب " LEMYTHE DE SISPHE"کا اردو ترجمہ "سیفس کی کہانی" کے نام سے شائع کیا۔

انیس ناگی کا دور ایک ذہنی کشمکش کا دور تھا۔ جس میں زندگی کی معنویت کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔ ان کے ناولوں میں بے معنویت، انفرادی آزادی، روایات کی نفی، وجود کی تلاش اور انسان کی معاشرتی بے بسی کا اظہار دکھائی دیتا ہے۔ اس حوالے سے انیس ناگی کے ناول "دیوار کے پیچھے"، "میں اور وہ" اور "زوال" تینوں ناول بہت زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ اسی لیے ان تینوں ناولوں کو منتخب کیا گیا ہے۔ یہ تینوں ناول لایعنیت اور عدمیت جیسی تنقیدی اصطلاحات کو ساتھ لے کر چلے۔

دوسرے باب میں انیس ناگی کے مختصر تعارف اور منتخب ناولوں کے ناولوں کے خلاصوں کے بعد ان ناولوں پر عدمیت کی تینوں اقسام کا اطلاق کیا گیا ہے۔ سیاسی عدمیت: انیس ناگی کے ناول دیوار کے پیچھے، میں

اور وہ اور زوال میں سیاسی عدمیت کے نظریات موجود ہیں ۔ ان ناولوں میں دکھایا گیا کہ ناول کے مرکزی کردار سیاسی نظام سے اکتا گئے ہیں اور وہ اس پورے نظام کو رد کرنا چاہتا ہے۔ اخلاقی عدمیت: تینوں ناولوں کے مرکزی کردار اخلاقی روایات کی نفی کرتے ہیں۔ وجودی عدمیت: تینوں ناولوں میں مرکزی کردار وجود کو غیر اہم سمجھتے ہیں اور اسے رد کرتے ہیں اور انہیں ایسا کرنے پر معاشرہ مجبور کرتا ہے۔

تیسرے باب میں لایعنیت کے عناصر کے جائزے کے بعد منتخب کردہ ناولوں میں ان عناصر کو تلاش کیا گیا ہے۔ خودکشی: انیس ناگی کے ناول دیوار کے پیچھے میں مرکزی کردار زندگی کی بے معنویت کو محسوس کرنے کے بعد خودکشی کرتا ہے لیکن ناکام رہتا ہے۔ جیسا کہ کامیو نے کہا تھا کہ انسان جب اس بات کو قبول کر لے زندگی بے معنی ہے تو وہ سب سے پہلے خودکشی کرتا ہے۔ انیس ناگی کے ناول میں اور وہ اور زوال میں خودکشی کا ذکر نہیں کیا گیا۔ فلسفانی خودکشی: انیس ناگی کے ناول دیوار کے پیچھے میں فلسفانہ خودکشی کا ذکر موجود ہے جبکہ میں اور وہ میں اور زوال میں فلسفانہ خودکشی کا ذکر نہیں کیا گیا۔ بے معنویت: تینوں ناول میں زندگی کی بے معنویت کے نظریات موجود ہیں۔ تضاد: تینوں ناولوں میں مرکزی کردار اور معاشرے کے درمیان تضاد کی فضا قائم ہے۔ بے ربط پلاٹ: دیوار کے پیچھے اور میں اور وہ کا پلاٹ بے ربط دکھائی دیتا ہے جبکہ زوال کا پلاٹ ایسا نہیں۔ سیاہ مزاح: تینوں ناولوں میں سیاہ مزاح موجود ہے۔ بے معنی مکالمے: بے معنی مکالمے تینوں ناولوں میں بہت کم دکھائی دیتا ہیں۔

مجموعی طور پر ان تینوں ناولوں میں عدمیت اور لایعنیت کے بھرپور نظریات دکھائی دیتے ہیں۔

نتائج:

اس تحقیق کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ تقسیم ہند کے بعد پاکستانی عوام انفرادی آزادی، اپنے حیاتیاتی وجود اور نئی شناخت کے حوالے سے ذہنی کشمکش کا شکار تھی اور اس کے بعد لگنے والے مارشل لاء پاکستانیوں کے لیے کسی بھیانک خواب سے کم نہ تھے۔ مارشل لاء نے انسان کو بے بس، مجبور اور لاچار بنا دیا جس کی بدولت انسان نے زندگی، اپنے وجود اور تمام سیاسی سماجی اور معاشی اقدار کو بے معنی اور لغو سمجھنا شروع کر دیا یہی وہ دور تھا جب پاکستان میں لایعنیت اور عدمیت کے نظریات پروان چڑھنا شروع ہو گئے۔ اردو ادب میں زندگی کی بے معنویت، مذہبی، سیاسی، سماجی، علمی، اخلاقی نظریات سے انکار کیا جانے لگا اور

کامیو، سارتر، کافکا جیسے مغربی مفکرین کی تحریروں کے ترجمے کیے جانے لگے۔ لہٰذا اردو ادب کے موضوعات میں وسعت آنے لگی چنانچہ اس تمام صورتِ حال کو اردو ادب کے لکھنے والوں نے بہت شدت سے محسوس کیا نہ صرف شدت سے محسوس کیا بلکہ اپنی تحریروں کا حصہ بھی بنایا۔ جن میں انور سجاد، انتظار حسین، عزیز احمد، فہیم اعظمی اور انیس ناگی کے نام شامل ہیں۔

انیس ناگی کا شمار اردو ادب کے اہم ناول نگاروں میں ہوتا ہے اسی لیے ان کے ناول دیوار کے پیچھے، میں اور وہ اور زوال پر عدمیت اور لایعنیت کا اطلاق کیا گیا ہے۔ اس تحقیقی مقالے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں انیس ناگی کے تینوں ناولوں میں سیاسی عدمیت، اخلاقی عدمیت اور وجودی عدمیت کے نظریات موجود ہیں ۔ان ناولوں کے مرکزی کردار سیاسی نظام، اخلاقی روایات اور وجود کی اہمیت کو رد کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ زندگی کو بے معنی سمجھتے ہیں اور ان کے نزدیک انسان اس دنیا میں کچھ بھی نہیں کر سکتا کیوں کہ وہ کچھ ہے ہی نہیں۔

تحقیقی مقالے کی تکمیل کے بعد یہ حقیقت آشکار ہوئی ہے کہ انیس ناگی کے ناول دیوار کے پیچھے میں سب سے زیادہ سیاسی عدمیت پائی جاتی ہے۔ اس ناول میں دکھایا گیا کہ ناول کا مرکزی کردار پروفیسر سیاسی نظام سے اکتا گیا ہے اور وہ اس پورے نظام کو رد کرنا چاہتا ہے۔ یہی وہ نظام ہے جو اس کا دشمن بن گیا ہے اور اسے جینے نہیں دیتا۔ انیس ناگی کے ناول میں اور وہ میں سیاسی عدمیت کے نظریات دکھائی دیتے ہیں۔ اس ناول کا مرکزی کردار سیاسی نظریات اور اداروں کو رد کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ وہ ناول کے آغاز ہی میں کہتا ہے کہ سیاست کو نئے شعور کی علامت سمجھا جاتا ہے لیکن میرے کوئی نظریات نہیں۔ یہی نظریہ ہمیں پورے ناول میں دکھائی دیتا ہے۔ انیس ناگی کے ناول زوال میں بھی سیاسی عدمیت کے نظریات دکھائی دیتے ہیں۔ اس ناول کا مرکزی کردار احسن ایک سرکاری ملازم ہے جو سیاسی نظام سے تنگ ہے۔ اور وہ اس سے فرار چاہتا ہے۔ یہی وہ نظام ہے جو سب کا ذہنی استحصال کر رہا ہے اور انسان اس کے سامنے بے بس ہے۔

اس تحقیق کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ انیس ناگی کے ناول دیوار کے پیچھے میں اخلاقی عدمیت کے نظریات دکھائی دیتے ہیں۔ ناول میں مرکزی کردار پروفیسر ہر موڑ پر اخلاقی اقدار کی نفی کرتا ہے۔ وہ اخلاقی روایات کو بے معنی سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ سب جھول اور انسان کو قید کرنے کے نظریات ہیں۔

میں اور وہ میں بھی مرکزی کردار اخلاقی عدمیت کا حامل دکھائی دیتا ہے۔ ناول میں دکھایا گیا ہے کہ وہ ان تمام اخلاقی روایات کو رد کرنا چاہتا ہے لیکن یہ معاشرہ اسے کرنے نہیں دیتا جہاں سے بے بسی جنم لیتی ہے۔ انیس ناگی کے ناول زوال میں بھی اخلاقی عدمیت کے نظریات موجود ہیں اس کا مرکزی کردار احسن ایک بیماری میں مبتلا ہے اور کوئی اس کو دوا نہیں دے رہا ڈاکٹروں نے ایک کاروبار شروع کیا ہوا ہے۔ اسی تمام صورت حال میں احسن جگہ جگہ اخلاقی اقدار اور روایات کو مسترد کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ احسن ازواجگی زندگی سے تنگ ہے اور اسے لگتا ہے کہ یہ سب فضول نظریات ہیں۔

انیس ناگی کے ناول دیوار کے پیچھے میں وجودی عدمیت کے بہت سے اثرات موجود ہیں۔ دیوار کے پیچھے کا مرکزی کردار پروفیسر ہر موڑ پر اپنے وجود کی اہمیت سے انکار کرتا ہے اور اسی کشمکش میں وہ خودکشی کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر وہ ناکام رہتا ہے۔ اور یہی ناکامی اسے یہ سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ اس کا وجود کتنا بے معنی ہے کہ اسے موت نے بھی قبول نہیں کیا۔ ناول میں اور وہ میں بھی مرکزی کردار وجودی عدمیت کا قائل ہے۔ دفتری معاملات، معاشی مسائل اور سیاسی صورتِ حال اسے وجودی عدمیت کے نظریات ماننے پر مجبور کرتے ہیں۔ وہ انہی معاملات کی وجہ سے کمرے میں بند ہو کر رہ جاتا ہے۔ جب وہ ملک سے باہر جاتا ہے اور باہر سے واپس آتا ہے تو تمام ادارے اسے شک کی نگاہ سے دیکھتے جس کی وجہ سے وہ خود کو غیر اہم سمجھنے لگتا ہے۔ ناول زوال میں بھی وجودی عدمیت کے نظریات موجود ہیں۔ اس ناول کی کہانی ہی احسن کے وجود کے زوال کی ہے۔ ناول کا مرکزی کردار ایک مہلک مرض میں مبتلا ہے جس کی تشخیص نہیں ہو پاتی۔ وہ اسی بے چینی اور اذیت میں مبتلا رہتا ہے۔ اور آہستہ آہستہ وہ جسمانی طور پر کمزور ہوتا جاتا ہے۔ جس سے اسے یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کا موجود کتنا بے معنی اور غیر اہم ہے۔

اس تحقیقی مقالے میں لایعنیت کے عناصر کا منتخب ناولوں پر اطلاق کیا گیا ہے۔ مقالے کی تکمیل کے بعد یہ نتیجہ سامنے آیا ہے کہ ناگی کامیو کے نظریہ لایعنیت سے بہت متاثر تھے انہوں نے اپنے ناولوں میں ان کے نظریات پیش کیے ہیں۔ منتخب ناولوں میں لایعنیت کے تمام عناصر موجود ہیں مثلاً زندگی کی بے معنویت، بے ربط پلاٹ، تضاد، سیاہ مزاح اور بے معنی مکالمے وغیرہ۔

اس تحقیق کے بعد یہ بات سامنے آئی ہے کہ انیس ناگی کے ناول دیوار کے پیچھے میں مرکزی کردار زندگی کی بے معنویت کو محسوس کرنے کے بعد خودکشی کرتا ہے لیکن ناکام رہتا ہے۔ جیسا کہ کامیو نے کہا تھا کہ انسان جب اس بات کو قبول کر لے زندگی بے معنی ہے تو وہ سب سے پہلے خودکشی کرتا ہے۔ انیس ناگی کے ناول میں اور وہ اور زوال میں خودکشی کا ذکر نہیں کیا گیا۔ اس تحقیقی مقالے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ انیس ناگی کے ناول دیوار کے پیچھے میں فلسفانہ خودکسی کا ذکر ہے جبکہ میں اور وہ اور زوال میں فلسفانہ خود کشی کا ذکر موجود نہیں ہے۔

یہ تحقیق اس حقیقت کو سامنے لائی ہے کہ انیس ناگی کے منتخب کردہ ناولوں میں زندگی کی بے معنویت کے متعلق نظریات پیش کیے گئے ہیں۔ منتخب کردہ ناولوں میں مرکزی کردار اور معاشرے کے درمیان تضاد کی فضاد کھائی دیتی ہے۔

اس تحقیق کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انیس ناگی کے ناول دیوار کے پیچھے اور میں اور وہ کا پلاٹ بے ربط ہے۔ لیکن زوال کا پلاٹ بے ربط نہیں دکھائی دیتا۔ منتخب کردہ ناولوں میں بے معنی مکالموں اور سیاہ مزاح کا استعمال بہت کم کیا گیا ہے۔

سفارشات:

۱۔ انیسویں صدی کے ناول نگاروں کے ناولوں میں عدمیت کے اثرات کو ڈھونڈنے کی ضرورت ہے۔ جیسے کہ انور سجاد، انتظار حسین اور قرۃ العین جیسے ناول نگاروں کے ناولوں میں عدمیت اور لایعنیت کا اطلاق کیا جاسکتا ہے۔

۲۔ لایعنیت کو وجودیت سے ہٹ کر دیکھنے کی ضرورت ہے۔ اکثر دونوں کو ایک ہی تھیوری کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ نیز اس کا سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی کے افسانوں پر اطلاق کیا جاسکتا ہے۔

۳۔ عدمیت پر اردو ادب میں بہت کم کام کیا گیا ہے لہٰذا اس تھیوری پر مزید کام کرنے کی ضرورت ہے۔

۴۔ انیس ناگی کی شاعری پر عدمیت اور لایعنیت کا اطلاق کرنے کی ضرورت ہے۔

۵۔ انیس ناگی کے ناولوں پر مغربی مفکرین کے فکری اثرات دیکھنے کی ضرورت ہے۔ جیسے البرٹ کامیو، کافکا اور نطشے وغیرہ

کتابیات

بنیادی مآخذ(WORKING BIBLIOGRAPHY)

انیس ناگی، دیوار کے پیچھے، زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور، ۱۹۸۳ء

انیس ناگی، زوال، فیروز سنز پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۹ء

انیس ناگی، میں اور وہ، عالمین پبلشرز پریس، لاہور، ۱۹۸۴ء

ثانوی مآخذ(SECONDRY SOURCES)

احسن فاروقی، ڈاکٹر، ڈاکٹر، ناول کیا ہے؟، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنو، س ن

انیس ناگی، نئے ادب کا معمار، حسن پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء

اشفاق احمد، آب گم، مکتبہ دانیال، کراچی، ۱۹۹۰ء

انیس ناگی (مترجم)، سیسیفس کی کہانی، البیر کامیو، اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۱۹۹۷ء

انیس ناگی، ایک ادھوری سرگذشت، حسن پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء

انتظار حسین، بستی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئ دہلی، ۱۹۸۰ء

حیات احمد حسینی، ڈاکٹر، وجودیت، بتول پبلی کیشنز، سری نگر، ۱۹۹۰ء

سعادت حسن منٹو، منٹو نامہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۵ء

شہزاد منظر، مشرق و مغرب کے چند مشاہیر ادبا، مکتبہ دانیال، کراچی، ۱۹۹۶ء

شاہین مفتی، انیس ناگی: شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء

عصمت چغتائی، لحاف، روہتاس بکس، لاہور، ۱۹۹۶ء

ممتاز احمد خان، پروفیسر، آزادی کے بعد اردو ناول، فضلی سنز، کراچی، ۱۹۹۷ء

ممتاز احمد خان، پروفیسر، اردو ناول کے ہمہ گیر سروکار، ماجرا سرائے پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۰۸ء

منشی پریم چند، گئودان، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئ دہلی، ۱۹۸۸ء

ارشد وحید (مترجم)، ناول کا فن، میلان کنڈیرا، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۱۷ء

ناز قادری، پروفیسر، اردو ناول کا سفر (تحقیقی اور تنقیدی جائزہ)، مکتبہ صدف، مظفر پور، ۲۰۰۱ء

لغات:

جمیل جالبی، ڈاکٹر، قومی انگریزی اردو لغت، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء

J.A Cuddon, A Dictionary of literary terms and literary theory 5th edition, A john willey and sons , Ltd publication, UK ,2013

رسائل:

ادبِ لطیف، لاہور، جولائی تا ستمبر ۱۹۸۸ء

سہ ماہی ادبیات (خصوصی شمارہ: اردو ناول ڈیڑھ صدی کا قصہ، شمارہ نمبر ۱۲۱-۲۲)، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۹ء

سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۳۴، ۳۳، اکادمی ادبیات پاکستان، ۱۹۹۸ء

English books :

Bernard Reginster , The Affirmation of life ,Harvard University press ,2006

Emanuele Severino , The essence of nihilism , verso , New york ,2016

Friedrich Nietzsche , The will to power , translated by WalterKaufmann and R.J Hollingdale , Vintage books , New York ,1968

Gideon Baker , Nihilism and philosophy , Bloomsbury academic ,United kingdom , 2018

Justin O' Brien , Albert Camus , The Myth of Sisyphus ،Neil Cornwell ,The Absurd in Literature , Manchester university press , New York , 2006

Michael Y.Bennett, The Cambridge Introduction to theatre and literarure of the Absurd , Cambridge university press , United kingdom, 2015

James Tartaglia , Philosophy in a meaningless life , Bloomsbury publishing plc,2016

Joan P.Couliano ,The Trees of Gnosis gnotic mythology from early Christianity to modern nihilism , HarperSanFranciso harper Collins publishers , 1992

Nolen Gertz , Nihilism , MIT press Cambridge , Massachusetts, London , England , 2019

Ray Unbound , Nihil unbound Enlightment and Extinction ,Palgrave macmillan , New york ,2007

Stephen Pax Leonard ,Travels in cultural nihilism some essays ,Arktos Media Ltd, London , 2017

ویب سائٹس:

www.academia.edu

www.britannica.com

www.newworldencyclopedia.org

www.pdfbooksworld.com

www .philosophyterms.com

www.pk11ib.org

www.rekhta.org

www.researchgate.net